



فَصْلِ (قَبَی)

الجنوب

ایک نیا کتاب
✓
نکاح و عیش
تمام
رہتا ہے

اجنبی

(ناولے)

تصنیف: اکبیر کامیو
ترجمہ: ڈاکٹر افضل اقبال
تعارف: ڈاکٹر حسن عسکری

ناشر

آئینہ ادب چوک مسینار انارکلی لاہور

جلد حقوق محفوظ

پہلی بار: ۱۹۷۹ء

تعداد: ایک ہزار

قیمت: پندرہ روپے

اہتمام

امجد سلیم، آئینہ ادب چوک مسینار

انارکلی — لاہور

فون نمبر — ۶۷۵۰۲

— طفیل آرٹ پرنٹرز — لاہور —

خَالِدِہ
کی یاد میں

کوئی محسوس نہیں مٹتا جہاں میں
مجھے کہنا ہے کچھ اپنی زبان میں
(عاقبہ)

ہے۔ جو عرب و عرب کو صرف۔ اختیار حاصل ہے کہ وہ ان دفعہ کے عوض عمر بھر کے لئے اپنا سب کچھ ناموس و عزت و معصیت و ذل ایک سرہ کی فدا کر دے۔

اسی نادانی کی ایک مثال کہنے کا کردار اسی خود بخود ہی سے پیش کیا گیا ہے کہ پڑھنے والے کو اس سے ذمہ داری گہری سمجھ رہی ہو جاتی ہے۔ بلکہ جب اسے ذرا کچھ ہی سزا دیتی ہے تو اس کے دل پر بہت غصہ آتا ہے۔ بلکہ اس کے جب عرب و عرب کی خاموشی برتی ہے تو اس پر کسی کو کڑی نہیں آتی۔ ایک عرب کو یہی جوان موت کی گھاٹ اُتار دیا جاتا ہے اور قاری کی سمجھ کو اس وقت تک تمام تر قافلی کی طرف اُٹتا چلا جاتا ہے۔

نادان کے پیرو میں جو سرکار کا کردار بہت ہی سادہ اور سیدھے ہے۔ وہ ایک غیبت و چسپ شخصیت ہے۔ مگر اس کا سمجھنا کچھ اسی قدر آسان نہیں ہے۔ وہ اکثر کم کُسم دیتا ہے۔ کسی کچھ بات کرتا ہے تو یہی ایک آدمی جو کچھ کچھ ہی طنز و ہجو سا کہتا ہے۔ مگر وہ سمجھ رہا ہے کہ یہ سب باتیں اس کے لئے ہیں۔ اس کے لئے یہ سب باتیں اس پر خوش ہو جاتا ہے اور جتنی سے جتنی باتیں اس سے کہیں جوتے۔ ایک سادہ لوح انسان ہے۔ ہر زمانہ اس کی زندگی کی چھٹی چھٹی خوشیوں پر وہ چٹو لگا نہیں سکتا اور بڑے بڑے رنج و غم بھی خوشی برداشت کر لیتا ہے۔

دلگہ ہے دوستوں کا دشمنیت زمانہ

غرض ایک مجروحہ افسانہ ہے۔ اور ان کو کہہ غرضی سے بچاؤ۔ کچھ چپ نہیں پڑتا اور سمجھ بھی کرنا کرتا ہے۔ وہ بہت کچھ کہتا بھی تو نہیں۔

چنانچہ قدم قدم پر غم کو کہیں کہیں بھی۔ عقلوں کے صفی تو گفت میں لی جاتے ہیں۔ مگر حسروں کی تہ تک پہنچنا جان بوجھ کر کام ہے۔ ہم نے برسوں کو کشش کی مگر آخر کار تنگ

پیش لفظ

"اجنبی" پہلی بار ۱۹۴۷ء میں لکھا تھا۔ مجرب افسانہ کا یہ سب سے پہلا باب کا قریل پر از حد تو اس مختصر ناول کا دنیا میں بہت چرچا ہوا۔ اس میں اس وقت ہندوستان میں پاکستانی سفارت کا دیر لڑی تھا۔ اس دن فرانس کے مشہور فلسفی پال ساٹر کا بہت شہور تھا۔ وہ فرانس میں اس کے لئے فلسفہ پیش کی تحریک پر گہرا گرم غم میں ہوا کرتی تھی۔ یہ بھی اس دن ہی تھی سے اعلیٰ انداز پر تھے۔ مگر صحیح بات تو یہ ہے کہ اس کا فلسفہ صحیح طور پر کسی کے چپے نہ پڑتا۔ افسانہ کا یہ کہ پال ساٹر کی تحریک سے گہرا متعلق تھا۔ چنانچہ جب یہ ناول لکھا گیا تو یاروں نے اس کی تعریف میں زمین آسمان کے کھلے کھلے ملادینے۔

اس میں بہت سارے اجنبیوں کے ساتھ تھا۔ مگر ایک انجلی کی طرف وہ ان کے متعلق کی تہ تک نہ پہنچ سکا۔ اور ان کی تہ تک پہنچنے سے ڈاٹے وہ بھی کچھ نہ پہنچ سکا۔

اسی نادانی کی ایک عرب و عرب کی خوب پٹائی برتی ہے۔ اسے دوسرا اور دنیا کی جاتا ہے مگر کسی کے کان پر جان تک نہیں رہتی۔ یہیں معلوم ہوتا ہے کہ ایک عرب و عرب کو عزت کرنے کا کوئی حق ہی نہیں رہتا۔ وہ اپنے ہی ملک میں ایک غیر ملکی کی طرف ایک دانتی کی رہا کرتا ہے۔ فرانسیسی یہی تو تھا کہ اس کے بعد بھی دوسرے مردوں سے راہ و رسم پر کیا کرتی

دیکھیں۔ ڈاکٹر عسکری فرانسیسی زبان کے مزاج سے خوب واقف ہیں اور اردو کے تو ایک صاحب طرز محقق ہیں۔ انہوں نے اپنی کے ایک ایک جملہ کو خود سے پرکھا، محاورے اور تذکرہ تائیت کی جرحطیلوں انہوں نے درست کی، و معروف ایک صاحب زبان کا ہی حصہ تھا۔

اب ایک طویل مدت کی ہیں ویش کے بعد میں حیات کر رہے ہیں کہ یہ بڑا بڑا کتب کے سامنے پیش کروں۔ اگر آپ میں سے ایک آدھ پڑھنے والے نے بھی یہ کتاب پسند کی تو میں یہ سمجھوں گا کہ میری برہمن کی محنت ٹھکانے لگی۔

آخر میں مجھے دو دوستوں کا خالص طور پر شکریہ ادا کرنا ہے۔ ڈاکٹر آفتاب احمد نے مجھے یہ شہرہ عظیم کا پاکستان میں کاغذ کی بہت کمی ہے، اس لئے کتاب چھپوانے کا خیال فی الحال ترک کر دینا چاہئے۔ پروفیسر محمد سرور نے کھسا کر آخر کیوں؟ ہمارے یہاں کتابوں پر نہ مصنف نہ ناشر گزاراقت کر سکتا ہے۔ اگر تکمیل ذوق ہی مقصود ہے، تو پھر ایسے ناشر کی طرف رجوع کیا جائے جو دلی کامنے کے لئے اڈے اور مضمناں بیٹا ہے اور ادب کی خدمت کی خاطر معیار کی کتابیں چھپاتا ہے۔

پاکستان ڈسٹریکٹ ڈپٹی کمشنر (مرشدیہ)

افضلہ اقبال

۲۶ دسمبر ۱۹۵۴ء

آکر کام اور صراحت پڑھ دیا۔ جب اپنی تسلی نہ ہو تو کسی اور کی صحت خواہی سے کیا حاصل پڑا کہ فرانسیسی ایک خوبصورت کیونکی زبان ہے اور گیسو شے ڈووا بھی منت پذیر تھا نہ ہے ایسے میں اس قدر صاف ناول کا کامیاب ترجمہ کیونکر ہو سکے گا۔ اور اپنے جملہ کا یہ نام کہ نہ ایک زبان بر قدرت سے نہ دوسری پر۔ جڑائی کے جوش میں خواہ مخواہ دو کام شروع کر ڈالا جس سے اچھے بھلے استاد گھبرائیں۔ دکانی ترجمہ کا مسودہ میرے کاغذات میں پڑا اور میرے ۱۹۵۲ء میں برازیل میں پاکستان کا سفیر تھے۔ گیلگاہا پاک پائڈ پڑی۔ برازیل میں میری صحت کا خاطر خواہ بندوبست نہ تھا۔ چنانچہ انہیں اسان پاؤں سے ہاتھ پڑا یہاں تک کہ ایک بڑا پریشی ہوا۔ ان کی تیمارداری کے وہ زبان میں نہ دیکھا کہ میری زخمی اور مریض فرانسیسی سے خوب واقف ہے، وہ میرے ناول پڑھ رہی ہے۔ جی ہاں کہ جی کے ساتھ مل کر پھر سے اپنی کتاب کا ترجمہ کیا جائے۔ ہم نے ہسپتال میں کام کا آغاز تو کر دیا مگر

مشق اسان ترو اول وسلہ افتاد مشکلا

خدا خدا کرے کہ گیلگاہی روٹی ہسپتال سے ہوتی۔ اللہ نے اُن کی زبان بخشی اور ہم ترجمہ کا کام ٹھہرا گئے۔ پچھلے برس ڈاکٹر محمد اعلیٰ نیہاب نے خود ملنے کے داکٹر چاندروتنے دو مہینے ہم تاحق ہیں اور جگر کی دوست میں نے اُن سے اپنی تاحق کا ذکر کیا تو انہوں نے سواد اٹھا کر ڈاکٹر لطیف باری کو بھیج دیا۔ ڈاکٹر باری اُن دنوں گورنمنٹ کالج لاہور میں فرانسیسی زبان کے استاد تھے۔ انہوں نے میری کوشش کو نہ صرف سراہا بلکہ دوست کے قریب نکالیں تواریق کی۔ میں ڈاچنگ کا بہت کر کے نظر ثانی کے لئے وقت تلاش کیا۔ مگر میری اس قدر غلطیاں نظر آئیں کہ میں نے آخر کو کام کا آغاز کیا۔ سال ہر کی محنت کے بعد جب مجھے ذرا اطمینان سا ہوا تو میں نے ڈاکٹر صاحب عسکری کو تکلیف دی کہ وہ اردو کا کام مسودہ کو اپنے نظر

تعارف

’اجنبیوں‘ کا نام تو ہر مسلمان کی حیثیت سے مگر مشرکوں سے اب شریعت کے حصے تک یہ ایک تاریخی دستاویز بن گیا ہے۔ اسے تو دورِ مری جب خیم سے ایک کینا جاسکتا ہے، دستِ شریعت کی علامتوں کی شورش سے نہ مغرب کے نوجوانوں کی ادنیٰ اور ذہنی و اخلاقی پرکھ لگی ہے۔ نہ مغربی شہروں کی ماحول اور بے نقطہ تشدد پسندی سے مراد یہ نہیں کہ یہ مادی شوقین، اسی کتاب سے پڑا ہوا ہے، مگر یہ کتاب اس پوری صورت حال کا ایک جزو ضرور ہے۔ اور اس میں بھی شک نہیں کہ مغرب میں بھی مشرق میں جو کچھ نوجوانوں کی ذہنی ماضیت و پرورش میں اس کتاب کا خاصا دخل ہے۔ چنانچہ فی الحال اس کتاب پر مصلحانوں کی حیثیت سے فکر کرنا کافی نہ ہوگا۔

علامہ ابنی اس کتاب کو مہنتِ آئینہ کا میو کی ذائقہ زندگی سے بھی ایک کے نہیں دیکھا جاسکتا۔ فرانسی سے باہر کامیو کی نسبت دوسری جنگِ عظیم کے بعد ہوئی اور دورِ بیت پسند و انسانی دوست، ڈراما نویس، ناول نگار اور فلسفی کی حیثیت سے دنیا کے سامنے آئے ساتھ ہی وہ کسی نہ کسی شہرت کو اور ہرادی اور انیسویں صدی کے زیست دانے گروہ سے متعلق سمجھا گیا۔ مگر چند دن گزرے گئے کہ ان کی سادگی سے تو فیہ میں بھی گہمی اور سادگی

نے اعلیٰ کر دیا کہ کامیو کا فلسفہ زیست والی ماضیت سے کوئی تعلق نہیں، بلکہ وہ فلسفی بھی نہیں مطلقاً، غلط ہیں۔ یہ فرانسیسی ادب کی ایک خاص اصطلاح ہے جو سترہویں صدی کے اُن اویسویں پر دلالت کرتی ہے جنہیں ذہنی انسانی کی تفسیق کا شوق تھا اور اپنی اس تفسیق سے چٹا اخلاقی تانے بھی باندھ کر رکھے تھے۔ گراں میں سے مصلح تانے ہم مشرقی لوگوں کو جو اخلاقی سے تریب پر تسلیم ہوں گے۔ نیز ہمیں دلوں یہ لڑائی ہوئی اُن زمانے میں سادگی استوار کی مخالفت اور حریت پسندانہ نگرانیوں کی حمایت کر رہے تھے۔ گراں فی الحال وہ گھٹنے کے سر جھکیں گے، بیٹ کی حرف کے بعد ان اسرائیل کے حامی ہیں۔ سادگی کی جوت پر استعمار کے حامیوں نے کامیو کو بانس پر چڑھایا اور انیسویں صدی کے دوست کلابادہ کو کھایا۔ کامیو نے بھی اس سادگی کا خوب حق ادا کیا اور انسانی جذبات سے ہمدردی اور وقتِ قلب کے بدلنے اور ان کی تحریک آزادی کی مخالفت کرنا لائی اور فوجی پرائز بھی جیتنے میں ملے۔ یا۔ اگر مری کے ایک بے نقطہ حوالے میں وہ ہلک نہ ہو جاتے تو کئی اور انعام سے بچے ہوئے۔

یہ باتیں مٹانے سے میرا مطلب تاریخی کو اس کتاب اور اس مہنت سے بغلی کرنا نہیں، بلکہ ان کی زندگی و ماضیت کو واضح کرنا ہے۔ یہ کتاب پڑھے بغیر آپ نہ تو مغرب کے موجودہ محاورے سے پوری طرح واقف ہو سکتے ہیں نہ مغرب کی سیاست سے۔ جب تک مغرب کے لوگ اندھا دھند مغرب کے ذہنی رجحانات کا اثر قبول کر رہے ہیں، وہ ان ملک مشرق کے مصلح طبقوں کو سمجھنے کے لیے بھی یہ کتاب پڑھنا ضروری ہے کہ ان کی غلطی، ان کے ادبی رسالوں میں کچھ اعلیٰ انفرجی حروف میں چھپا ہوا نظر آتا رہتا ہے۔ مری اس کتاب کی کچھ تفسیریں ہیں۔ یہ ناول بھی ہے، اخلاقیات کی کتاب بھی ہے،

فصل طرازی بھی ہے اور مغربی معاشرے میں رونما ہونے والے اثرات اور تباہی کے نتیجے سے نوجوانوں کے لئے ہدایت نامہ بھی۔

پچھلے ناول کے اعتبار سے دیکھئے۔ یہیں جگہ تعلیم اور دوسری جگہ تعلیم کے برعکس مغربی ناول میں ایک رجحان یہ بھی پلٹا تھا کہ جس چیز کو عام لوگ کہانی کی تمام دیتے ہیں، وہ مغرب کے کم ہو۔ اس کے برعکس مغربی ناول اور امریکی مینیکٹ کے وغیرہ کے ناول بھی تھے جس میں واقعات اور مبالغہ آلودہ انسانی کی نفسی اہمیت تھی۔ مگر فی الجملہ جدید طرز کے ناولوں میں دروں میں کا رنگ بڑھا ہوا تھا۔ کہ تیسرے دروں میں اور نو دروں کے کہنا ہے۔ اپنے ناول کی بنیاد پر کئی پرکھی۔ لیکن کی جتنی یہ تھی کہ جو افعال اور واقعات میان کئے جائیں وہ اتنے عمومی ہوں کہ سب کیسے ہی جائیں۔ یوں تو اس ناول میں تو کئی چیز ہے۔ لیکن اس طرح بیان کیا گیا ہے کہ جیسوں انگریزی کی شوق میں نہیں آتا۔ تعلق کرنے والا ایک خود کا دشمن کی طرح مل کر ہے۔ اس لئے یہ واقعات نہایت سے خالی ہے۔ جہاں کیا چیز یا اتفاقیات بیان کرنے کا تعلق ہے یا کام ڈولاس کے پیرس میں سما چلے سے کر رہے تھے۔ کہ تیسرے خارجی ماحول کی طرف واقعات بیان کی ہیں جو ایک مڑو دل اور بے کیفیت آدمی کے شعور میں مضبوط اہمیت دے دیتی ہیں۔ اس کی سکتی ہیں۔ اسی بات کو ان کے تصدیق خوانوں میں کہتے ہیں کہ تیسرے کا طرز تقریر بڑھتی ہے اور وہ اس کی تعلیم سے بچتے ہیں، جو غیر بڑی پر محنت کا مفصل ہے کہ زندگی کے ہر لحاظ سے اکٹرا ہٹ اور بے یقینی کی تعبیر کیا گیا ہے۔ مرکزی کردار کا شعور اس وقت جاگتی ہے جب اس سے ارادے کے بغیر ایک تعلق برقرار رہتا ہے اور اسے ٹیل میں رہنا پڑتا ہے۔ یہاں سے کہانی عام نگاری کے لئے بھی دلچسپ ہو جاتی ہے۔ خصوصاً قصہ کے کی کارروائی۔ لیکن انہی واقعات سے

کے کا تیسرے اپنے افعال پرانی اور مضبوط دیکھتے پیدا کئے ہیں۔

کہ نگار نگاری میں کا تیسرے کی جہت یہ ہے کہ ان کے ناول کا ہیرو کوئی واضح شخصیت ہی نہیں رکھتا، بس حالات کا غلام ہے۔ خارجی زندگی میں بھی اور داخلی زندگی میں بھی اور عموماً بھی وہ چراغ کلا کے شہروں میں پھیلے تو سب مل جاتے کے برادری کی جوتی ہیں۔ تو اس کے جذبات میں کوئی شہت ہے۔ واضحاً سات میں تازگی۔ سوچنے کی صلاحیت تو اس میں ہے ہی نہیں، بلکہ اپنی سبھی کا شعور بھی نہایت مبہم ہے۔ یہی کہ کر شعور میں نہ ہونے کے بعد اسے اپنی ذات کا احساس ہوتا ہے اور عموماً کارروائی کے دوران ٹرمتا جاتا ہے۔ بیک حالات اسے معاشرے اور انسانی زندگی کے بارے میں بھی سوچنے پر مجبور کرتے ہیں۔ دراصل اس عمل کو سوچنا نہیں کہا جاسکتا۔ یہ بیرونی شہروں کے عام آدمیوں کی طرح نہیں ہے، اس کا ذہن اور خود حرکت کر رہی نہیں ہے۔ لیکن حالت میں اسے نئے جزبات نہیں ملے ہیں۔ وہ کہتا ہے کہ اس کے معمول سے شعور اور بے اثر فعل کو اسے بعضی پہنا سے ہمارے ہیں۔ مثلاً اس کی تنگ دلی کا شعور یہ ہے کہ جب اس کی ماں کا جنازہ تدفین کا انتظار کر رہا تھا تو اس نے تیسرے کی ایک پانی قبول کر لی تھی۔ اسی طرح کے خارجی واقعات اسے سوچنے پر توجہ دیتے ہیں کہ تیسرے پر مجبور کرتے ہیں کہ اس کے معاشرے میں، اور پھر انسانی زندگی میں کوئی بات فعل کے مطابق نہیں جوتی اور اس کا چھوٹے سے چھوٹا فعل یا احساس معاشرے کی نظر میں معنوی ہی سکتا ہے۔ اور یہ ہے کہ معاشرے کو فخر کرنے کا فی نہیں جانتا اور صرف وہی کہتا ہے جو حسرتی کرتا ہے۔ اب اسے پتہ چلتا ہے کہ وہ اس معاشرے کا لاکھ نہیں بلکہ محض ایک ہی اور بچہ ہے۔ اس سے آگے بڑھ کر وہ دیکھتا ہے کہ معاشرہ تو آگے رہا، وہ تو پورے نظام زندگی اور حالات میں بھی اپنی کی حیثیت رکھتا ہے، وہی

ہے اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ ہم کو ایک مسرت انگیز اور سرخرو زندگی کی مثال دیکھتے ہیں وہ پارٹی نہیں ہونے پاتی۔ اگر آپ دوسال کے بچے سے اس کا کھانا چھین لیں تو اس کی چیز سے بھی یہی غصہ برآمد ہوگا۔ بچہ کی کیا کیا حالت ہے؟ مغرب کے دانش ور دل کی ذہنی مہلوس اتنی ہی ہے۔ اس بچہ کو وہ ماہر الطبیعت کہتے ہیں مغرب کا ذہنی زوال چوبیس صدی میں شروع ہوا تھا۔ آج مغرب کو اشعلی طاق اس منزل کی طرف تڑھتا ہوا دیکھ رہے ہیں۔ جہاں ذہنی مکمل کرنا ٹھیک ہوتا ہے۔ سترہویں صدی کے شروع میں دیکھتے تھے انسانی وجود کی یہ دہلیز پیش کی تھی۔

”ہم سوچا ہوں اس میں جتنے ہیں۔“

سراسر مادی عنصر و تصور اور اس کے تقدیر کے یہاں اس کی شکل یہ ہو گئی:

”میرے اندر جہر پیدا ہوتا ہے۔ اس لئے میں ہوں۔“

انیسویں صدی کے وسط میں ایک حیثیت سے جو پیدائش کا قوی ہے:

”میرے حواس غصہ کا کم کر رہے ہیں۔ اس لئے میں ہوں۔“

میں مادی بعد دل ہوا یا

میرے حواس غصہ کا کم کر رہے ہیں۔ اس لئے میں ہوں۔

مسئلہ کے قریب معاشی اداسیاں جہاں پھیلا تو ناکرو، ہیپٹک وے اور ان کے ہم فائبر وے

میں آزادی طور پر مادی فعل کا ارتکاب کرتا ہوں، اس لئے میں ہوں۔

دوسری جنگ عظیم کے دوران کا تیسرے انسانی ذہنی کو باطل ہی غارت کر دیا:

”مجھ سے فیضان آزادی طور پر بلے معنی و مقصد مہجانی فعل سرزد ہو سکتا ہے یاں

تھے شاید میں ہوں اور۔“

کامی چیز سے کوئی رشتہ نہیں۔ چونکہ اپنے معاشرے یا کائنات کی زندگی سے یکجہت کا رشتہ حاصل کرنے کا کوئی طریقہ بھی اس کی سمجھ میں نہیں آتا۔ اس لئے اس کی حیثیت باطن کی بھی ہر جاتی ہے۔ ہمارا یہ حقیقت اس کی سمجھ میں آ جاتی ہے کہ زندگی اور کائنات کا نظام بلے عقل و عرب اور یوں کی اصطلاح میں کا محفل، مہل، بلے معنی، بلے مقصد اور جہت ہے۔ یہ فرمان حاصل کرنے کے بعد وہ خوشی خوشی پرانی کشتی پر چڑھ جاتا ہے۔

اس کہانی اور اس کردار کے ذریعہ کا تیسرے پچھتے سرزد ہونے کی قیادت کی غامی دکھائی ہے کہ وہ فرد کی داخلی کیفیت اور مادی کو نظر میں رکھتے بغیر ٹیک اور بلے فیصلے صادر کر دیتی ہیں۔ اور اس طرح فرد کے ساتھ ہمیشہ بلے انصافی ہوتی ہے۔ یہ فقہ و نظر نیا نہیں۔ انیسویں صدی کے ردی ڈاؤن نگار یہ بات بار بار کہ چکے ہیں۔ مغربیات کا یہ تصور سوز و گداز سے مملو ہے۔ بچہ اگر اس پر عمل کرنے لگے تو دنیا میں مادیات اور قانون سب معطل ہو جائیں۔ مغرب کے بعض فوجی پانچ سو سال سے مقصد قتل کرنے کے بعد اس اصول کے سبار سے اپنے آپ کو بلے گناہ ثابت کر لیتے ہیں۔ غور کا تیسرے اپنی ایک ایک اپنی فرد کے لطیف احساسات سے بہرہ ور کرتے ہوئے یہ نتیجہ نکال چکا ہے کہ اولاد کو آزاد نہیں کرنا چاہئے تھا۔ اس طرح کا تیسرا مجوزہ اخلاقی نظام ایک طرف تو مغرب کی معاشرت کو کم کر رہا ہے اور دوسری طرف مغربی معاشرہ کا حیا بھی ہے۔

اس ڈاؤن سے جو فلسفہ برآمد ہوتا ہے اس کا چھل یہ ہے کہ انسانی حیثیت کے مظاہرہ معاشرے کے حوالی زندگی اور کائنات کی نیز نگاہیں ہر چیز کا معقول ہے بلے مقصد ہے انجیل اور مہل ہے۔ یہ کہ کو کم کر رہا ہے اور ان احساسات سمجھتے ہیں اس کے خلاف جاتی

نے سورہ ملک میں انسانی کو ایک خاص مراقبہ کی تعلیم دی ہے فرمایا ہے کہ ہماری بنائی ہوئی
 کائنات پر بار بار نظر ڈال کے دیکھو، اس میں تبسیر کوئی دشمن نظر آتا ہے؟ جب کسی دیکھو گئے
 قہقارہ نظر درآمد ہو کہ کوٹ آئے گی۔ اس مراقبہ کے بعد بھی آدمی میں بصیرت پیدا نہ ہو
 تو اس کا مطلب یہ ہے کہ اس کی آنکھیں دیکھ نہیں سکتیں۔ اس کی ٹہنی نہیں کھٹے۔ دل سمجھ نہیں
 سکتا۔ چنانچہ کائنات کو رحمت اور لامعقول بتانے والوں کے متعلق سورہ صافات آیت ۲۸
 میں فرمایا ہے:

وَمَا خَلَقْنَا السَّمَاءَ وَالْأَرْضَ وَمَا بَيْنَهُمَا بَاطِلًا ۚ ذَٰلِكَ نَفَعُ
 الْغَافِلِينَ ۚ كَذَّبُوا وَافَقُوا فَلْيَمْنُوا بِمَا نَحْنُ بِاللَّهِ ۚ

وہم نے آسمان و زمین کو اور جو چیزیں ان کے درمیان موجود ہیں ان کو بے
 از حکمت نہیں بنایا کیا۔ یہ ان لوگوں کا خیال ہے جو کافر ہیں۔ مگر کافروں کے
 لئے جہنم خرابی ہے۔ یعنی دوزخ و جہنم ان کے لئے اثرات علی گھناؤنی ہیں

یہ تصور ہر آدمی کو لازمی جز ہے اور مہاسیت میں بھی موجود ہے چنانچہ
 کتاب فقہ میں آیا ہے کہ قرآن نے کائنات بنانے کے بعد اس پر نظر ڈالنی تو دیکھ کر کہتے
 اچھے ہے۔ اسی بات کو ازمنہ و اعلیٰ کے مسافر تصوف میں یوں کہا کہ کہتے تھے کہ ہماری دنیا
 ساری ٹھنڈی دنیاؤں میں بہترین ہے اور جو کچھ موجود ہے۔ جو کچھ واقعہ ہوتا ہے اس کے
 مقصد اور نتائج بہترین ہوتے ہیں۔ یہ تو قرآن کی کل اٹھارہویں صدی کے رہائی فلسفہ ہوں
 منسوب ہیں خصوصاً نائب مکرر۔ لیکن نائب مکرر نے اس حقیقت کو یہ معنی دے دیئے ہیں
 کہ موجودات اور قوتات کے بہترین مقاصد اور نتائج انسانی عقل کی گرفت میں آ سکتے ہیں۔
 روحانی فلسفہ اس اصول پر اس سختی سے عمل پیرا ہوئے کہ محض خیال ہی گئے مثلاً محض

اور جب انہی کا سرکڑی کر دیا جاتا ہے تو اسے چمکتا ہے کہ اس کی پوری سچی
 مہمل اور عبث و قزاقی شریف کی مصلحت میں باطل ہے۔ اپنی جہتی، اپنی معاشرہ اور اپنی
 کائنات اسے بے معنی معلوم ہوتی ہے کیونکہ جس قسم کا عدل اور سترت ہمسواریت اور ولایت
 حاصل کرنے کی اسے متعلق و تعلق پوری نہیں ہوتی اس حقیقت کے غرض کا نام مغرب
 میں باطل الطبیعیاتی کرب اور بیگانگی رکھا گیا ہے۔

اس حقیقت کا باطنی نام براہِ راستی ہے۔ اپنی مرضی کے مطابق سترت اور برہنہ
 زندگی بسر کرنے کی، میں کوئی کھنڈ نہیں ہے جس میں ہمیشہ اور ہر زمانے میں رہی ہے۔ یہ
 غفلت انسانی کے غیر میں ہے۔ اس لئے اللہ تعالیٰ نے سورہ نجم میں اس بات پر غور
 کرنے کی تعلیم دی ہے کہ انسان میں چیز کی متا کرنا ہے کیا وہ اسے ہمیشہ مل جاتی ہے
 مگر انسان اس حقیقت کو تسلیم کرنے سے گھبراتا ہے۔ اور اسے شیطان اسے ایسی چیز ہی
 امیدیں دلاتا ہے۔ اسی لئے قرآن شریف میں یہ مضمون بار بار آیا ہے کہ کافر اصل میں کوئی
 جہنمی کو بوجھتے ہیں۔ لیکن ان کا خدا ہے۔ مثلاً لیکن سے کہ مارا کرے تک سب کا خدا
 یہی ہے، یہ خدا مختلف شکلیں اور نام اختیار کرتا ہے۔ قرآن شریف نے کافروں کے عقائد
 کرتے ہوئے بار بار یہ بھی کہا ہے کہ ان خداؤں کو تم پوجتے ہیں تم نے تو گھر سے ہی اور
 تم نے ان کے خدا سے آباد و بار دے ان کے نام ہی خود ہی رکھے ہیں مثلاً ایدہم ہمسو
 دوسو ہمارے، فیثیثے، فریثیثے، ہر کسوں، ڈی ایچ کوئی، اساتذہ اور کامیوں نے شروع سے آج
 تک سب کافروں کے رنگ پر رنگ مفسدوں کا بنیاد میں اصول یہی رہا ہے کہ تمام کائنات
 ہماری برادریوں کے مطابق نہیں ہیں، اس لئے عبث اور لامعقول ہے۔ ہماری رائے کے
 مطابق چلتے گئے تو باطنی معقول اور مربوط بن جائے گا۔ اس کے برعکس قرآن شریف

انسانی ترکے میں سے چند تصرفات ابھی باقی ہیں جو قتل کرتے وقت تو اسے یاد نہیں تھے تھے، لیکن اپنے آپ کو مصیبت پڑی تو اس کی کھوپڑی میں ٹکھارے لگے۔ مثلاً عقل، عجز، عدل۔ عقل کی کمزوری میں اس پر یہ بھی جوتی ہے کہ زندگی اور کائنات نہ تو عقل کو تسکین دیتی ہے نہ جذبات کو۔ خصوصاً انسانی فتنوں کو تو دنیا بھی پرانا نہیں کرتی۔ لہذا کائنات عبت اور باطل ہے۔

کاتیر کے نزدیک یہی اصل واقعہ ہے اور حکمت ہے بعض لوگوں نے اعتراض کیا کہ اس طرح سواری اتار دینا تم جو باقی ہیں اور زندہ رہنے کا جواز بھی باقی نہیں رہتا اس کے جواب میں کاتیر نے کہا کہ کائنات کے عبت جو ہونے کا طریق تو دانش مندی کی طرف پہلا قدم ہے۔ یہاں سے اگلے چل کر ہر فرد اپنے سے ایک خدمت نظام زندگی کا شکر کر سکتا ہے۔ چنانچہ اس بات کے مطابق جن لوگوں نے سلوک کی راہ میں قدم بڑھایا، ان میں سے بعض چرس پینے لگے، بعض شاربہ چوس کے راہ گیر ہو کر دنیا پر سامنے گئے اور بعض یہ خواب دیکھنے لگے کہ اگر سواری دنیا کا تیل اور معدنی ذخائر ہمارے قبضے میں آ جائیں تو پھر راہی جیسی ہی جیسی کہتا ہے۔

یہ تو ہر مغرب کی دانش وری ہے۔ میں سے پوری طرح واقف ہونے کے لئے اس نادل کو حضرت عثمانؓ جگر اس کے رموز کو اچھی طرح سمجھنا لازمی ہے۔ دانش وری کی مصنف کوئی چار سو سال پہلے شروع ہوتی ہے۔ گو گمنامی کی شاعر سترے تو چودھویں صدی کے آخر میں ہی اعلان کر دیا تھا کہ وہ اب مہات کا دور شرارت جوتا ہے لیکن افسوس کا نقطہ آغاز یہ اصول ہے کہ اپنی زندگی کی تعلیم کے لئے انسان وہی کی رہنمائی سے آزاد ہو کر اپنے لئے اقتدار خود ہی پیدا کر سکتا ہے۔ چار سو سال کے عرصے میں ہم نے دیکھا کہ مغرب نے

نے کہا کہ زلزلے سے پریشان کے لوگ تباہ ہوئے تو اس سے یہ فائدہ ہوا کہ ہشتیا کے لوگ بچ گئے۔ اس لئے دانشور جیسے عقل پرست نے اپنی کہانی مکالمہ دینے میں انی مسکین کا خاک اڑایا۔ روسو نے عقل کی نافرمانی سے نصرت یعنی انسانی فتنہ اور حیثیت کی پردہ کو اصول نکالا۔ اس کا خیال تھا کہ کائنات کے سارے تضاد جذبات کے ذریعے حل ہو سکتے ہیں۔ یہ وہ اصل دانش اور فتنہ پرور پریشانیٹ لوگوں کا مذہبی عقیدہ ہے۔ برومیر کے زمانے تک یہ بھی پتہ چلا گیا کہ زندگی اور کائنات کے تضادات جذبات کی مدد سے بھی دور نہیں ہوتے، بلکہ جذبات ایک خوفناک جہنم پیدا کرتے ہیں۔ رابن ہونے دینی کیا کہ میں تو اسی جہنم میں اتروں گا اور اسی کو جنت میں تبدیل کروں گا۔ مگر اسی زمانے میں منصفی نظام بھی زور پکڑا تھا اور انسانی کشمکشیں میں تبدیلی کو نہ چلا جا رہا تھا۔ یہ رنگ برومیر جیسے شاعروں کے علاوہ مارکس نے بھی دیکھ کر افسوس افسوس نے ماضی اور زندگی کے مظاہرہ میں انسانی دور کے انسان کی جگہ کی پروری غریب باقی جنت صرف کی ہے۔

کاتیر کے ناول میں انسانیت میں یہ جگہ ہے۔ اب نہ تو اس کی عقل کام کرتی ہے نہ جذبات، البتہ انسانیت کی آخری نشانی جنت رہ گئی ہے اور وہ بھی میکائی طور پر عمل کرتی ہے جس میں نہ تو انسانی ادب ہے نہ عقل ہے نہ اختیار کو۔ نادل بکھرنے کو وار ہے ایک نقل سرزد ہو جاتا ہے کیونکہ مصوب تیر ہے اور اس کی آنکھیں چند صدیاں گئی ہیں۔ یہ شخص ہزار اونی اور بیگز نہ بھی دیکھ دوسرے انسانوں کے درمیان رہنے پر مجبور ہے۔ یہ لوگ بھی اپنی میکائی عادتوں کے مطابق عمل کر رہے ہیں جو یہی ماسٹر کی اخلاقی یا انسانی اقتدار کہتے ہیں۔ لہذا یہ لوگ قاتل کر سبیل میں ڈال دیتے ہیں۔ قاتل مشین تو یہ پہلے سے دیکھ کر مرنے کو راضی نہیں، جب تک صبا گئی کھٹی ہوئی، ابھی پھر کڑی رہی ہے۔ صدیوں کے

جو اقدار بھی پیدا کیوں ہو اور آدمی کا تصور تخیل اور خود مغرب کے لئے تھا تو کائنات جبروتی نظام کا کائنات کو اقدار جبروتی صدی والوں کی طرح معتزل سمجھ جائے یا مسیحی صدی والوں کی طرح لامعتزل یا دیگر واحد ہو گا۔

اس کے برخلاف وحی کی رہنمائی یہ ہے کہ اقدار وہی کا و آدمی کی جوا اقدار تعالیٰ کے احکام کے ذریعے قائم ہوں۔ پھر اشد تعالیٰ کے احکام بھی دو قسم کے ہوتے ہیں۔ ایک تو تکوینی اور دوسرے تشریفی۔ فی الاصل دونوں قسم کے احکام کی مصلحت پوری ہے اشد تعالیٰ کی گرفت میں نہیں آسکتی کیونکہ اسلام میں انسانی عقل کو دین کا لائسنس دیا گیا تھا۔ فرائض اور دوسرے مجتہدین کے نزدیک تشریحات کے دائرے میں جو امری احکام ہیں ان کی مصلحت عقلی دوا کی کے ذریعے ثابت کی جاسکتی ہے۔ اسب سے جزئیات میں ایمانی مغرب ضروری ہے۔ لیکن جنی احکام کی مصلحت معلوم کرنا ہمارے لئے ناممکن ہے۔ کیونکہ یہ چاہے تو دہی جانی مکتا ہے جو کائنات کے ذریعے آتے سے اور اس کی ابتدا و انتہا دونوں سے واقف ہو اور یہ ہم بھی معرفت اشد تعالیٰ کو حاصل ہے جس میں کوئی لکھ کا شریک نہیں۔ انسان حکمت ہے صرف تشریحات احکام پر عمل کر کے لیکن جنی احکام میں وہی دانا اشد تعالیٰ اقدار کی موافقت کرتا ہے وہاں سے جہت نہیں تھاتا۔ کا فر تعالیٰ قدر سے لڑتا ہے۔ اور وہی دنیا پر جگہ خوار ہوتا ہے۔ جس مکتا ہے کہ بعض دفعہ کوئی احکام اور تشریحات احکام میں گھبراہٹ و اضطراب نظر آئے۔ مثلاً اشد تعالیٰ نے تشریع حکم دیا کہ معرفت میری عبادت کرو اور میری عبادت پر شکر ادا کرنا چاہئے اور کفر بھی یہ حکم بھی دیا کہ کفر اور کفر سے نفرت کرو۔ لیکن ساتھ ہی یہ بھی بتایا کہ کفر اور کفر سے نفرت کرنی چاہئے یعنی اور عبادت پیدا نہیں کی۔ ان احکام کا تضاد دور ہوتا ہے ایمانی کے ذریعے۔ مغرب والوں کے نزدیک ایمانی کا مطلب ہے

ایک جذباتی کیفیت جس کا عقل سے کوئی واسطہ نہیں۔ مغرب جب انسانی عقل کو چھوڑتا ہے تو نیچے جبروتی جبلت میں گر جاتا ہے۔ ہم جب انسانی عقل کو چھوڑتے ہیں تو اوپر اٹھتے ہیں۔ چاہے نزدیک عقل بھی اور قسم کی ہے۔ عقلی معاش اور عقلی مساوی۔ ترقی شریف نے بتایا ہے کہ عقل مساوی کا مقام ہے قلب و مغرب والوں کے نزدیک عقل بھی جبلت کی آواز کا ہے اور قلب بھی جبلت کے مترادف ہے۔ اس عقل مساوی کے ذریعہ اسلام ایمانی اور ایمانی کی حقیقت حاصل ہوتی ہے عقل معاش یا نفس کی نظر سے دیکھا جائے تو کائنات جہت اور باطل معلوم ہوتی ہے۔ عقل مساوی کی نظر سے دیکھا جائے تو کائنات کا حق ہونا ظاہر ہو جاتا ہے۔ کیونکہ کائنات کا بنانے والا موجود حق ہے۔

کائنات کو جہت سمجھنے سے کیسی زندگی پیدا ہوتی ہے وہ تو ہم اوپر دیکھ ہی چکے ہیں۔ زندگی کو حقیقی معنوں میں مربوط بنانے کا نسخہ کیا ہے میں قرآنی شریف نے دیا۔ سورہ اکل موائی میں ایک طویل دعا آئی ہے جس کے مختلف اجزا کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور خلفائے راشدین نے اپنے لئے خاص کر لیا تھا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خاص دعا مرتبہ پھر وہیں یہ تھی۔

ربنا ما خلقتنا هذاباطلاجه سبلنا فبقنا هذا به اذنا۔

اے ہمارے رب! تو نے ہمیں جہت نہیں پیدا کیا۔ تو پاک ہے ہمیں میں اذنی کے عذاب سے بچا۔

یعنی اشد تعالیٰ کو ہر نقص سے پاک سمجھنے کی ایک شرط یہ بھی ہے کہ افس کی بنائی ہوئی کائنات کو جہت نہ دیکھا جائے اور اے باطل مقام کی پیدائش سے اشد تعالیٰ کی پناہ مانگی چاہئے چنانچہ معزز ابو بکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ مقام خوف میں فرمایا کرتے تھے۔

رَبَّنَا آتِنَا مَا دَعَلْنَا عَلَىٰ رُسُلِكَ وَلَا تُخْزِنَا يَوْمَ الْعِلْمِ إِنَّكَ هَٰذَا تَعْلَمُ
لَا تُخْلِفُ الْعَهْدَ وَ-

(اے ہمارے رب! اور ہمیں دے جو اپنے رسولوں کی معرفت تو نے
ہم سے وعدہ کیا۔ اور ہمیں تیرا مت کے دن رسوا نہ کر۔ تو دے کے
خلاف ہمیں نہ کرتا۔)

انصاری میں بھی انبیاء کا نام نہیں چھوڑا۔ تنقائے اسی چیز کی جس کی جو شخص نے سمجھا
بکہ ان چیزوں کی حق کا وعدہ خود اللہ نے رسولوں کی معرفت کیا ہے۔ اور امید ہے بھی تو
اپنی عاقبت کے بعد دے گا۔ نہیں، بلکہ اللہ کی رحمت سے۔ غرض اپنے نفس کو چری طرح
اللہ تعالیٰ کے ارشادات اور اسی کے رسولوں کے فرمودات کے تابع کر دیا۔ یہ جو کچھ مربوط
زندگی میں جس میں اجنبیت اور بیگانگی کا نام و نشان تک نہ رہا۔ یہی حضرت شہاب الدین سہروردی
نے فرمایا ہے، اکیلا تو وہ جہتا ہے جو اللہ سے غافل ہو۔ جب نفس کی ایک خواہش اور
حرکت دلی کی تابو جو گئی تو نفس ہی تنہا ہو گیا۔ اب کوئی گناہ نہ رہا اور کوئی بیگناہ نہ رہا۔ سب حق ہی
حق ہو گیا۔

تو مغرب کی دانشمندی ہمیں کیا سکھائے گی۔ بے چاری لنگی کیا نہائے گی، کیا
جوڑے گی۔ لیکن مغرب کے دانشوروں میں ڈیڑھ دو جن ہم بھی ہے۔ یہیں دیکھتے رہنا چاہئے
کہ یہ انہیں وقت کی طرح مٹ کر رہے ہیں، اپنی عظمت کے لئے آپ کا تیر کا یہ ناول ٹکڑ
پڑھئے۔ کاتھیر کی کتابوں کے ایرانی مترجم مولانا احمد نے تو اپنے طویل مضمون مغرب
زندگی میں اس ناول کو "حقیرانہ معجزانہ ایک مشرقی بلکہ درست معجزانہ ایک مسلمانی معجزانہ"
کہہ کر اس کی آسمانی معتقدہ جود پر چڑھا ہے۔ اور اس کتاب میں تیرا مت کی علامتیں اور آثار

دیتا انکے لئے شد جیل انبار نقد احسنیتہ دوما لظلم لظلم
من انصار۔

(اے ہمارے رب! تو مجھے دوزخ میں ڈالے تو موزوں سے دوزخ کو دیا اور
سناہ کاروں کا کوئی ساتھی نہیں۔)

یہاں ان لوگوں کا عبرت ناک انجام دیا ہوا جہان ناک کو بہت کہہ کر اللہ تعالیٰ کی
سببیت سے انکار کرتے ہیں۔ ایسے انجام سے بچنے کے لئے انبیاء کی پیروی اور متابعت
ضروری ہے۔ ابتدا حضرت مہرذوق رضی اللہ تعالیٰ عنہ مقدمہ تہذیب میں یہ دیکھتے تھے،
وَقَبْلَ أَنْ تَأْتِيَنَا سَبْعًا مَعْنَا دِيْنَا مِلَادِي وَلَا يَمَانِي أَنْ آسَنُوا بِرَيْكَ وَفَاعَلْنَا
دَلْسَ هَارَ رَبِّ؛ ہم نے ایک پکارنے والے کو ایمان کے لئے پکارتے
ہوئے سنا کر اپنے پروردگار پر ایمان لے آؤ، سو ہم ایمان لے آئے،
اس کے بعد ضرورت ہوتی ہے دل سے اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع کرنے اور اپنی
ظہیوں کی معافی چاہنے کی۔ چنانچہ حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ مقام انابت میں فرمایا
کرتے تھے۔

رَبَّنَا خَاطِبُ لَنَا دُفْعًا مَعْنَا سَيَاتِنَا وَتَوَقُّفًا مَعْنَا لَاسِيَارًا
دَلْسَ هَارَ رَبِّ؛ ہمارے گناہ بخش دے اور ہماری براہیروں کو ہم سے
آوارہ دے اور ہمارا تھکوں کے ساتھ خاتمہ کر۔

اس کے ساتھ یہ بھی لازمی ہے کہ آدمی اپنے اعمال اور عبادات کی قبولیت کی امید
دکھے کہ چونکہ حدیث شریف میں آیا ہے کہ ایمان خوف اور امید کے دو حصوں میں ہوتا ہے اسی
لئے حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ مقام رہا میں فرماتے تھے:

پاسے میں۔ اور اپنے مصنفوں کو اس طرح قسم کیا ہے:
 "ہمیں مناسب قلم خود را بایں آیه تقطیع کنیم کہ فرمود: — انصرفت
 انما مع رؤس القوم"

موجن مکتوبی

۱۰ اگست ۱۹۰۷ء

①

لحقے آٹا پل بس یا شاید کل، مجھے ٹیکس معلوم نہیں۔ ہڑتوں کی رہائش گاہ سے مجھے
 یہ تار وصول ہوا:

"اقتی انتھالی کرگنچ۔ جنازہ کل بہترین دکھائیں۔"

اس سے تو کچھ واضح نہ ہوا۔ شاید کل ہی کا واقعہ ہے۔

ہڑتوں کی رہائش گاہ مارینگیری ہے۔ ابیرے، کوکریٹر۔ میں دو بجے کی بس پر
 شام ڈھلے تک اٹان پہنچ جاؤں گا۔ اس طرح میں جنازہ میں شامل ہر سکون گا۔ اور کل شام آخر
 بجے وٹ آؤں گا۔ میں نے اپنے افسر سے دو دن کی اجازت مانگی۔ دوپہائی مصروفی کی کہ وہ
 انکار تو نہیں کر سکتا تھا مگر وہ طعن بھی نظر نہ آتا تھا۔ میں نے اسے کہا بھی کہ
 "یہ میرا قصور نہیں ہے۔"
 اُس نے جواب نہ دیا۔

میں نے پھر سوچا کہ مجھے یوں نہ کہنا چاہئے تھا۔ خود مجھے تو پتہ نہیں کہ کیا تھا۔
 بلکہ اسی کا فرض تھا کہ وہ قائم ہو چکا کرے۔ مگر پرسوں جب وہ مجھے باقی ہاس میں دیکھے
 گا وہ یقیناً اظہارِ ہمدردی کرے گا۔ فی الحال تو کچھ یوں معلوم ہوتا ہے کہ جیسے اقی مری ہی

مزید کتب پڑھنے کے لیے آج ہی وزٹ کریں : www.iqbalkalmati.blogspot.com

نہیں۔ دفنی کے بعد یہ معاملہ مستند ہو جائے گا جب سرکاری کثافات میں اس کا انداز ہو جائے گا۔ میں نے دو بجے والی ٹرک پر بھی گرجی بہت قہقی۔ میں نے حسب معمول سیٹ کے ریستورائ میں کھانا کھایا۔ سب نے میرے ساتھ اظہار ہمدردی کیا۔ سیٹ نے مجھ سے کہا:

”ہر ایک کی جان ایک جی ہوتی ہے۔“

جب میں چلا تو وہ مجھے دروازہ تک چھوڑنے آئے۔ میں ذرا گھبرا ہوا تھا بڑی تھا کہ میں اینجیل کے یہاں جلدی جاؤں اور اُس سے ایک کافی کافی اور ایک کالاباز بند ادھار مانگوں۔ کچھ جیسے ہوئے امی کا چہرہ تھا۔ میں فوراً وٹن سے رخصت ہوا۔

یہ بھاگ بھاگ، یہ جلدی، بس کے چھلکے، پٹرول کی بو، شرک کی نظرائی اور مصوب کی تیزی، ان سب نے میری سر پکرا دیا۔ میں تقریباً مارا راستہ آؤ گھنٹا۔ جب میں جاگا تو اپنا سر ایک سپاہی کے کندھے پر پایا۔ وہ مجھ پر مسکرا رہا تھا۔ اُس نے مجھ سے پوچھا کہ کیا میں کہیں زود سے آؤں ہوں۔ میں نے بات نہ کرنے کو کہہ دیا کہ ہاں:

بڑھوں کی رہائش گاہ گاہاں سے دو کوئی کے خانے پر ہے۔ میں نے یہ راستہ تبدیل کر لیا۔ میں اُس کو فوراً دیکھنا چاہتا تھا مگر چونکہ وہ مجھ سے کہا کہ پہلے ڈائریکٹر سے مل کر وادی ہے۔ وہ چونکہ مصروف تھا۔ مجھے ٹھوڑی دیر انتظار کرنا پڑا۔ اسی آٹا میں چوکیڑے سے تین کمرہ دار، آؤ کار میری ملاقات ڈائریکٹر سے ہوئی۔ وہ مجھے اپنے دفتر میں لایا۔

ایک پست قد بڑھا آدمی جو فرائض کی سمجھ (دراحدہ) کا اعتراف نہ تو اپنے کار کے باقی میں لگے تھے تھا۔ اُس نے مجھے اپنی پگھلی نیلا آنکھوں سے دیکھا۔ بڑا بڑا چٹا یا اور اتنی ہیریراٹھ تھوڑے کمرہ دار کہ مجھے سمجھ نہ آئی کہ یہ کمرہ یا پٹا تھوڑے پٹاں۔ پھر اُس نے

ایک ویشٹ دیکھ کر مجھ سے کہا:

”دارام مر سو یہاں تین برس ہوئے آئی تھیں۔ ایک آپ ہی اُن کا سہارا تھے۔“

مجھے یوں محسوس ہوا کہ وہ کسی بات پر مجھے علامت کر رہا ہے۔ میں نے اُسے سنبھالنے کی کوشش شروع کی جی الٹی کہ اُس نے مجھے ٹوکا اور کہا:

”بیٹا! آپ کو اپنی صفائی پہنچ کرنے کی ضرورت نہیں۔ میں نے آپ کی والدہ کا سارا نال دیکھا ہے۔ آپ اُن کی تمام سزوات پر دراز کر سکتے تھے۔ انہیں ایک ساتھی کی ضرورت تھی۔ آپ کی آمدنی معمولی ہے اور ہر حال وہ یہاں بہت غرض تھیں۔“

میں نے کہا:

”جی ہاں ڈائریکٹر صاحب!“

اُس نے مزید کہا:

”آپ کو معلوم ہے کہ یہاں اُن کے چند دوست تھے۔ وہ اگلے دنوں کے لوگ تھے اور ان کے ساتھ دارام مر سو کی باہم مشترک دلچسپائی تھیں۔ آپ نوجوان ہیں۔ آپ کے ساتھ وہ بڑھاپا ہیں۔“

یہ سہ تھا۔ جب وہ میرے ساتھ گھر میں تھیں، تمام وقت اُن کی خاموشی نکال دینا میرا ذمہ تھا کہ ان کو خوش رکھتا رہوں۔ جب وہ شروع شروع میں بڑھوں کی رہائش گاہ میں کہیں تو اکثر رویا کر تھیں، مگر وہ عادت کی بات ہے۔ اگر انہیں چند مہینوں کے بعد وہاں سے نکال دیا جاتا تو وہ اسے بھی پسند نہ کرتیں اور پھر دوتیں۔ یہ سہ نوعیت کی بات ہے۔ کچھ اسی وجہ سے پانچ سال میں وہاں تقریباً گیارہ نہیں کچھ وجہ یہ بھی تھی کہ میری اقوام شافی ہوتی تھی اور ان خستہوں کا ذکر یہ کیا کہ میں پڑھاؤ ٹکٹ خرید اور

دو گھنٹے کا سفر طے کر دے۔

ٹائر ٹیکر نے مجھ سے کوئی بات کی مگر میں نے کچھ تو جہز بندی۔ پھر اُس نے مجھ سے کہا:

”بہن! خیال ہے کہ آپ اپنی والدہ کو دیکھنا چاہتے ہیں؟“

میں کچھ کہنے لکھنا چر گیا اور وہ دروازے کی طرف میرے آگے چل پڑا۔ پھر میں سے اترتے ہوئے اُس نے مجھے بتایا:

”ہم نے اُنہیں لائق گھر میں رکھوا دیا ہے تاکہ دوسروں پر بگڑا اثر نہ پڑے۔ ہرگز تب جب کوئی چیز مرنا ہے تو دوسرے وقتیں وہی ملک پر نشانی رہتے ہیں۔ اور ہمارے کام میں حرج ہوتا ہے۔“

ہم ایک مہینے میں آئے جہاں بہت سے بوڑھے چھوٹی چھوٹی ٹوئیں ہیں گپ شپ کر رہے تھے۔ جب ہم وہاں سے گزرے تو وہ خاموش ہو گئے اور ہمارے بعد پھر بات چیت شروع ہو گئی۔ یوں معلوم ہوتا تھا کہ طوطوں کا مجمع ہے۔ ایک چھوٹی سی عمارت کے دروازے پر ڈائریکٹر نے مجھ سے رخصت چاہی۔

”میں یہاں آپ سے اجازت لیتا ہوں میری عمر سے لائق اگر کوئی خدمت جو تو میں اپنے دفتر میں حاضر ہوں۔ اصل تو جنازے کا وقت صبح دس بجے ملے ہو گیا ہے۔ بہن! خیال ہے کہ جب تک آپ میت کے پاس بیٹھنا پسند کریں گے۔ ایک آخری بات۔ معلوم ہوتا ہے کہ آپ کی والدہ نے اکثر اپنے ساتھیوں سے یہ خواہش ظاہر کی تھی کہ اُن کو مذہبی رسوم کے مطابق دفنایا جائے۔ میں نے تمام انتظامات کا ذرے ذرے کیا ہے، مگر میں چاہتا تھا کہ آپ کو بتا دوں۔“

میں نے اُس کا شکریہ ادا کیا۔ اتنی دیر یہ تو نہیں تھیں مگر انہوں نے طویل عرصہ بھی کبھی نہ سوچا تھا کہ اپنی زندگی مذہبی احکام کے مطابق گزار دیں۔

میں لاش گھر میں داخل ہوا۔ ایک بہت بڑی دوش اور صاف ستھرا کمرہ تھا۔ دیواروں پر تازہ سفیدی ہوئی تھی اور چھت پر رنگین شیشوں کی ایک بڑی کھڑکی تھی۔ کمرہ ساڈا سا دھوا سے آراستہ تھا۔ ایکس (عد) کی شکل میں آرام کرسیاں لگی ہوئی تھیں۔ دو کرسیاں درمیان میں لگتی پڑی تھیں اور اُن پر میت کا صندوق رکھا تھا۔ دو صحن اپنی جگہ پر تھا۔ کھڑکی پر مرت چمکتے ہوئے سچے نظر آتے تھے جہاں بھی طرف کے متنبہ کئے تھے۔ وہ حادث کی سیاہ چمکدار کھڑکی کے تختے پر لگے ہوئے تھے۔ تاروت کے پاس ایک عرب نرس تھی، سفید لباس میں اور سر پر شوش رنگ کا چمکا چیمے ہوئے۔ اس کو چوکھا دیر سے مقب سے کمرے میں داخل ہوا۔ وہ بھاگا ہوا آیا تھا اور کچھ باپ راتھا۔

”میں نے صندوق پر ٹھکانا لگا دیا تھا۔ اب مجھے دیکھ کر چلنے پڑنے لگے تاکہ آپ انہیں دیکھ سکیں۔“ اُس نے کہا۔

وہ صندوق کی جانب بڑھا لیکن میں نے اسے روک دیا۔ اُس نے مجھ سے کہا:

”تو آپ نہیں جانتے؟“

میں نے جواب دیا: ”نہیں۔“

وہ قسم لگا اور میں کچھ پشیمان ہو گیا۔ مجھے احساس ہوا کہ عروسی نہیں تھا کہ میں یوں کہتا۔ ایک لمحہ کے بعد اُس نے مجھ سے پوچھا:

”کیوں؟“

مگر میں میں ملنے کے اور کچھ اس بھی میں جیسے کہ وہ محض اپنی اطلاع کے لئے سوال

گروا ہے۔ میں نے کہا:

”مجھے معلوم نہیں۔“

پھر اُس نے اپنی سفید موچھوں کو تازہ دیتے ہوئے اور بغیر صبرِ طرف دیکھے

ہوئے آرام سے کہا:

”میں سمجھتا ہوں؟“

اُس کی آنکھیں خوبصورت تھیں، نلی اور شفاف اور اُس کے چہرے پر کبھی کسی غم کی
اوڈر ہی تھی۔ اُس نے مجھے ایک کرسی پیش کی اور خود بھی ایک کرسی کے کمرے سے پیچھے بیٹھ
گیا۔ نرس آٹھ گھنٹی پر تھی اور باہر دس دوڑے کی طرف چل دی۔ اس وقت چرکیا رننے
میںے کان میں کہا:

”انہیں سرطان کی بیماری تھی۔“

چرکیا بات میری سمجھ میں نہ آئی۔ میں نے نرس کی طرف نگہ اٹھائی۔ میں نے دیکھا
کہ اُس نے آنکھوں کے نیچے ایک چٹی باندھ رکھی ہے جو اس کے سر کے گرد جا رہی ہے۔
ناک کی اونچائی پر بٹن ہوا دھاتی اور اُس کے چہرے پر سونے کی سفیدی کے اوپر کچھ نظر
نہیں آ رہا تھا۔ جب وہ چلی گئی تو چرکیا رننے کہا:

”میں آپ کو تنہا چھوڑ کے جا رہا ہوں۔“

مجھے معلوم نہیں میں نے کیا اشارہ کیا مگر وہ میرے پیچھے کھڑا رہا۔ اپنے مقب
میں اُس کی موجودگی کا احساس مجھے پریشان کر رہا تھا۔ سر ہر کے وقت کرہ خوبصورت
روشنی سے بھر رہا تھا۔ دیکھیں شیشوں کے سامنے دو زہریلی کنبھنار رہی تھیں۔ مجھے غم میں
چرا کہ مجھے چرکیا نے غائب آ رہی ہے۔ میں نے بغیر ترس ہوئے چرکیا رننے سے کہا:

”آپ یہاں بیٹھ کر مر رہے ہیں؟“

اُس نے فوراً جواب دیا:

”پانچ برس سے۔“

جیسے وہ ازل سے میرے سوال کا انتظار کر رہا تھا۔

پھر اُس نے بہت باتیں کیں۔ مجھے یہ کہ بہت تعجب ہوا کہ وہ نرس کے سپتال کی نوکری
بیٹھ رہے تھے۔ اس کی عمر ۹۰ برس کی تھی اور وہیں کارپنٹر والا تھا۔ میں نے اُسے ٹوکا:

”اچھا تو آپ یہاں کے رہنے والے نہیں ہیں؟“

پھر مجھے یاد آیا کہ ڈاکٹر کیڑے کے پکے سپتال سے پہلے اُس نے مجھے اتنی کے متعلق
کچھ مشورہ دیا تھا۔ اُس نے مجھے کہا تھا کہ ضروری ہے کہ انہیں جلد ورن کر دیا جائے کیونکہ
یہاں گئی بہت جلدی ہے اور عام طور پر میدانِ علاج میں۔ پھر اُس نے مجھے بتایا تھا کہ وہ یہاں
کارپنٹر والا ہے اور اُس کو کسی طرح بلوائی نہیں سکتا۔ یہی میرا کام ہے کہ میتیں تین چاروں
دیکھتے ہیں مگر یہاں یہ ممکن نہیں ہے۔ یہاں تو عالم ہے کہ جھٹ موت پٹ دلو۔

اس پر اُس کی بیوی نے اُسے ٹوکا:

”چپ کھو رہو۔ یہ باتیں بھلاؤ سو کر کہنے کی ہیں۔“

بڑے سے کام پر ہال پر گیا اور اُس نے مجھ سے معافی مانگنا شروع کی۔ میں نے ٹلے

کہا:

”مگر کوئی بات نہیں۔ مگر کوئی بات نہیں؟“

مجھے احساس ہوا کہ اُس کی بات صحیح اور دلچسپ تھی۔

و کچھلے کر رہے ہیں بیٹھے ہوئے اُس نے مجھے بتایا تھا کہ وہ عراقی کی حیثیت سے

ہسپتال میں داخل ہوا تھا۔ جب وہ روئے صحت ہوا تو اُنہیں نے چوکیدار کی آسامی کے لئے درخواست دی۔ میں نے کہا کہ غلام یہ کہ وہ پیشتر ہے۔ اُنہں نے کہا کہ نہیں۔ میں ایک طرح سے پریشانی تھا کہ وہ جب دوسرے پیشتروں کا تذکرہ کرتا تھا تو اُنہں کے لئے وہ دوسروں کی ترکیب استعمال کرتا تھا اور کبھی کبھار انہیں بڑھوسا کا خطاب دیتا تھا مگر وہ مجھ پر ایسا نہیں کرتا۔ زیادہ جڑے نہیں تھے۔ مگر طبی طور پر یہ ایک ہی بات تو نہیں ہے۔ وہ چوکیدار تھا اور اس رتبے کے اعتبار سے اسے دوسروں پر فضیلت حاصل تھی۔

اب نرمی داخل ہوئی۔ آفتاب شریعت سے مغرب ہو رہا تھا۔ رات کا اندھیرا تیزی سے رنگیں شیشوں پر چھا رہا تھا۔ چوکیدار نے جہاں جہاں دیکھ کر معاندی ہوا تو میری آنکھیں چند سیلابی گئیں۔ اُنہں نے مجھے کھانے کا دعوت دی مگر مجھے بھوک نہ تھی۔ چرامن نے دو دوہرائی کافی کی پیش کش کی جو میں نے قبول کر لی۔ توڑی دیر بعد وہ ایک حشمت لئے ہرے فٹا۔ میں نے کافی پی لی۔ پھر مجھے سگریٹ پینے کی خواہش محسوس ہوئی مگر میں جبکہ ایک کوئی پی کر ہی کہتا تھا کہ حق کے سامنے سگریٹ پینا من سب ہے یا نہیں۔ چرامن نے سوچا کہ آخر انہیں کیا فرق پڑ سکتا ہے۔ میں نے چوکیدار کو ایک سگریٹ پیش کیا اور ہم دونوں پینے لگے۔

اس دوران اُنہں نے مجھے کہا:

”آپ جانتے ہیں کہ ماہر یعنی آپ کی والدہ کے دوست بھی یہاں ہیں۔“
 ”کبھی تو آپ کی شرکت کریں گے۔ یہ رسم ہے۔ مجھے کرمیاں اور کافی تیار کرنا چاہئے۔“

میں نے اُنہں سے پوچھا:

”کیا ممکن ہے کہ وہ جی بھجوا دے؟“

سفید دیواروں سے لگا کر روشنی میری آنکھوں پر سیجی چڑ رہی تھی اور میری جھل جھل ہو رہا تھا۔ اُنہں نے کہا:

”یہ تو ممکن نہیں۔ ہے تو کہ کچھ بجلی کی تاریں کچھ اس طرح لگی ہوتی ہیں کہ یا تو سادی بقیان صحت میں یا کوئی بھی نہیں۔“

میں نے پھر اُنہں کی طرف زیادہ توجہ نہ دی۔ وہ باہر گیا۔ وہاں اور گرمیوں کو سنوارا ایک تپانی پرکائی دان کے ارد گرد اُس نے درجی بھر چا میں کھا دیا۔ پھر وہ اتنی کی دوسری طرف میرے تعاقب میں گیا۔ نرمی بجی وہیں ایک فاصلہ پر بیٹھ بیٹھ کر تھی میں دیکھ تو نہیں سکتا تھا کہ وہ کیا کر رہی ہے۔ مگر اُنہں کے بازوؤں کی حرکت سے زیادہ جوتا تھا کہ وہ کوئی چیز پی رہی ہے۔ رسم خوشگوار تھا کہ اُنہں نے مجھے حارث پینپاتی کھلے دروازہ سے پھروں کی جگہ اندر آ رہی تھی۔ میرا خیال ہے کہ اس سے میں اُدھار گیا تھا۔

کسی سرسراہٹ سے میں چمک اٹھا۔ میری جوتیاں کھلی تو پھر کمرہ مجھے بہت روشن نظر آیا۔ سامنے کسی چیز کا کوئی سایہ نہ تھا۔ ہر زاویہ اور شیبہ ماف شفاف دکھائی دیتا تھا۔ اب اتنی کے دوست داخل ہوئے، تقریباً ایک دوسری۔ پھر پورے روشنی میں وہ خاموشی سے میل رہے تھے۔ وہ اس انداز سے بیٹھے کہ کسی کو کسی کے سرکھنے تک کی آواز نہ آتی۔ میں انہیں ثابت فرمے۔ بیکر رہا تھا۔ اُنہں کے چہروں کے فغوشی۔ اُن کی کوئی بھی حرکت میں نہ تھی۔ مگر پھر میں جیسے تھیں نہیں، اس تھا کہ وہ پہنچ جی دن بھر

ہیں۔ میں نے ان کی آواز تک نہ منی۔ تقریباً سبھی عورتیں ایسی ہی پہنے ہوئے تھیں، جہاں ہوں
نے کچھ ایسی انداز سے کرک باندھا ہوا تھا کہ ان کی قدمیں نمایاں ہو رہی تھیں۔ اب تک
میں نے غور نہیں کیا تھا کہ پورے عورتوں کے پیٹ کہاں سے اور کیوں کر ابھر سکتے ہیں
وہ تقریباً سبھی ڈبلتے تھے اور سب اتھن میں پھڑکی تھابت بیٹھتے تھے۔ مجھے حیرت
ہوتی کہ ان کے پیروں پر انکھیں دکھائی نہیں دے رہی تھیں۔ جہاں انکھ ہونی چاہتے
وہاں صرف ایک ہلکا سا نشان نظر آتا تھا جو عورتوں کا ایک گھونٹا سا۔ جب وہ بیٹھ گئے
تو ان میں سے اکثر مجھے ایک گونہ فحش سے دیکھ کر سڑھاتے رہے۔ ان کے بے انت
منہ بڑوں کو چہاڑے تھے۔ میری سمجھ میں نہ آتا تھا کہ وہ اعصاب کی بیماری میں مبتلا
ہیں یا مجھے سلام کرنے کی کوشش فرما رہے ہیں۔ میرے خیال میں وہ اپنے مخصوص انداز
میں مجھے آداب طریق کر رہے تھے۔ میرے خیال میں اپنے وہ مخصوص انداز میں مجھے آداب
عقل کر رہے تھے۔ میرے ذہن میں یہ بھی آیا کہ وہ چکیلا کے ارد گرد میرے مقابل
بیٹھتے ہوئے غفلت مارتے رہے ہیں۔ ایک لمحہ کے لئے مجھے یہ بہرہ خیال بھی سر جھا کر وہ
سب دوائی بیٹھے میرا حاسب کر رہے ہیں۔

تھوڑی دیر بعد ایک عورت نے روانہ خرچ کر دیا۔ وہ دوسری قطاری تھی۔
میرا اسے ٹھیک طرح دیکھ نہیں سکتا تھا کیونکہ وہ اپنے ایک ساتھی کے پیچھے چلی ہوئی تھی۔
وہ متواتر دیکھتے دیکھتے ہی کئی دیر مجھے بڑا غم تھا کہ وہ کبھی نہ منے گی اور اگر
اس کی طرف کوئی بھی نہیں دھر رہے تھے۔ وہ خاموش، منفرد اور خستہ حال بیٹھ رہے۔
ان کی نظر متیت پر یا اپنی چھڑی پر تھی۔ وہ کسی اور چیز کو نگاہ میں نہیں لاد رہے
تھے۔ عورت مسلسل روٹی رہی۔ میں بہت حیران ہوا کیونکہ میں اسے نہیں پہچانتا تھا۔ میری

چاہتا تھا کہ اس کی آواز میں یہ سنائی دے۔ مگر اُسے یہ کہنے کی جرأت نہ کر سکا۔ چکیلا
اس کی طرف دیکھا اور اُسے کچھ کہا۔ اس نے جواب میں سر ہلایا۔ کہاں میں کچھ جگہ سے کہا
اور پھر تسلسل سے روانہ شروع کر دیا۔ اس کے بعد چکیلا میری طرف آگیا اور میرے قریب
بیٹھ گیا۔ کافی عرصہ کے بعد اس نے میری طرف نگاہ اٹھاتے بغیر مجھے یہ اطلاع دی،
”وہ آپ کی والدہ کی جگہ کی دوست ہے۔ وہ کہتی ہے کہ یہاں وہ ان کی انگریزی
سیکھتی تھی اور اب اس کا دنیائیں کوئی بھی نہیں رہا۔“

میں خاموش رہا۔ اس کی طرح بہت دیر تک بیٹھ رہے۔ اس عورت کی آہیں اور
ہلکیاں ڈونگم ہوئیں۔ وہ انک بہت پوچھتی رہی اور آخر کار وہ بھی چپ ہو گئی۔ میں اور وہ
سویا لیکن تھک بہت گیا۔ میری کمر میں درد ہونے لگا۔ اب سب عورتوں کی خوشی سے
کچھ بڑن کو آواز تھا۔ منٹے کے ٹام میں گاہے گاہے صرف ایک آواز سنائی دیتی تھی
مگر سمجھ نہیں آتی تھی کہ وہ کیا ہے۔ آخر معلوم ہوا کہ چن بڑے سے اپنے غم کے گلوں کے
اندرونی حصے کو چرس رہے ہیں اور اس کا غم میں ان کے منہ سے ایک عجیب سی آواز
نکل رہی ہے۔ انہیں اس بات کا احساس تک نہ تھا کیونکہ وہ سب کے سب اپنے
خیالات میں لگی تھیں۔ مجھے ایک لمحہ کے لئے سوچ بھی کہ یہ میت جہاں کے وہ مریاں پڑی
ہے ان کے لئے کوئی مومن نہیں رکھتی۔ مگر اب مجھے یقین ہے کہ یہ ایک غلط خیال تھا۔

چکیلا نے ہم سب کو کافی چیخ کی۔ اس کے بعد کیا ہوا۔ مجھے یاد نہیں۔ رات بچا
تو گر گئی۔ مجھے اتنا یاد پڑتا ہے کہ جب میری آنکھ کھلی تو میں نے دیکھا کہ سب بڑے
ایک دوسرے کے کہنوں پر پڑے ہوئے ہیں۔ ہمارا ایک کے جڑا ہوا کمر پکڑ گئے
ہاتھ میں چھڑی تھابت میری طرف ٹھکی باز ہو کر دیکھ رہا تھا، کچھ اس انداز سے جیسے کہ

کچھ شور مچا اور پھر نر موشی چل گئی۔ آسمان پر سورج ڈھلا اور آجیلا اور میرے پاؤں گرم ہوا شروع ہو گئے۔ چوکھڑا مٹی سے گزر کر میرے پاس آیا اور کہا کہ ڈسٹر کیڑے مجھے بنا ڈا ہے۔ میں اس کے دفتر میں گیا۔ وہ سیاہ لباس پہنے ہوئے تھا اور اس کی پیروی مکیر دار مٹی۔ وہ ہاتھ میں ٹیلفون لئے ہوئے تھا اور میرے کہہ رہا تھا:

"جنرل بھڑا ابھی یہاں پہنچے ہیں۔ میں انہیں کہنے والا ہوں کہ صندوق بند کر دیا مگر اس سے پہلے آپ چاہیں گے کہ اپنی والدہ کا آخری دیدار کر لیں۔"

میں نے کہا:

"نہیں۔۔۔"

اُس نے آواز دھیمی کرتے ہوئے ٹیلفون پر حکم دیا:

"ان لوگوں کو کہہ دو کہ اب وہ جا سکتے ہیں۔"

پھر اُس نے مجھے بتایا کہ وہ جنازہ میں شامی ہوگا۔ میں نے اُس کا شکریہ ادا کیا۔

وہ باز پر بازو دوسرے اپنی میز پر بیٹھا گیا اور مجھے بتایا کہ جنازہ میں وہ اور صرف ایک نر شامی ہوں گے۔ اُس نے کہا:

"اسی طور پر پیشہ زنگوں کو جنازہ میں شامی ہونے کی اجازت نہیں ہے۔ دوسرے شب بھر میت کے پاس رت چھٹا کر سکتے ہیں۔ اس میں ان کا اپنا حصہ ہے۔"

اُس نے مزید کہا: "مگر اسے خاص طور پر حق کے ایک بڑے دوست کو اجازت دے دی ہے کہ وہ سب کے پیچھے پیچھے چل سکتا ہے۔ اس کا نام ماس پر ہے۔ یہاں ڈسٹر کیڑے مسکویا۔ اُس نے مجھے کہا:

"آپ سمجھ کر اس ٹیلفون پر ڈاکو سچا سنا۔ کیوں وہ اور آپ کی والدہ بھی ایک

دور سے میرے پیدا ہونے کی انتظار میں تھا۔ یہ بھڑا ڈگمگا گیا۔ جب جاگا تو میری مکر میں دو بڑھو گیا تھا۔ رنگین ٹیشیوں میں سبج اترا آئی۔ تھوڑی دیر بعد ایک بڑھا خواب سے بیدار ہوا اور زود سے کھانسنے لگا۔ اُس نے ایک ٹرسے نما زرد روٹاں میں گلہ صاف کیا پس لائیف بڑی مشکل سے خارج ہوا۔ اُس نے دوسروں کو جگا دیا۔ چوکھڑا نے کہا کہ اب جانا چاہیے۔ سب اٹھ کھڑے ہوئے۔ چڑھیا نے ٹنگ ہو کر مٹی کی صورت بنائی مگر جھٹے سے پہلے سب نے میرے ساتھ ہاتھ ملایا۔ مجھے بہت تعجب ہوا کہ صرف ایک ہی رات میں جس کے دوران کسی کے منہ سے ایک لفظ بھی نہیں نکلا۔ ہم سب کیونکر ایک دوسرے کے اسی قدر قریب ہو گئے ہیں۔

میں بہت تھکا ہوا تھا۔ چوکھڑا مجھے اپنے میاں لے گیا۔ وہاں میں نے منہ ہاتھ دھویا۔ پھر میں نے دودھ کے ساتھ کافی پی جس سے میری سکان کچھ کم ہوئی۔ باہر نکلا تو دن چڑھ چکا تھا۔ پہاڑوں کے اوپر جو دارگو کرستہ سے اُگ کر تھے۔ ڈور آتی تھیں کُڑھی ہی کُڑھی پہن چکی تھی اور ہوا میں جرسند سے آدھ چلی تھی، لنگ کی خوشبو مٹی میں ایک مدت کے بعد گاڑی میں آیا تھا۔ میں نے ٹھوس کی کہ اگر واقعی کا سلسلہ نہ ہوتا تو آج یہاں میر کر سنے میر کتنا لعنت آتا۔

کیوں میں صدم میں ایک درخت سے انتظار کرتا رہا اور ٹنگ زمین کی تازہ اور سونہ کی سوندھی جھک سے لطف اندوز ہوتا رہا۔ پھر میں نے سوچا۔ اب مجھے دفتر کے ساتھیوں کا خیال آیا کہ وہ اسی وقت کام پر جا رہے تھے اُسے ہوں گے۔ میرے لئے ہمیشہ بہتر ہے۔ اُنکا وہاں جان رہا ہے۔ میں نے ان باتوں پر ذرا اور غور کیا، کیوں بڑے ٹنگ میں کسی گھڑی کی آواز نے میرے خیالات کو ناقص توڑ دیا۔ مگر کیوں کے پیچھے

تھامے ہوئے تھا۔

میں نے کہا: کیا۔۔۔؟

اُس نے آسمان کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا

میں نے پھر کہا: "ہاں؟"

اُس نے پوچھا: "وہ کون سی سیڑھی تھی؟"

میں نے بات نکال دی تو یہ کہ انجیل کے ایک عرصہ معلوم نہ تھی۔ اس کے بعد وہ پشیم

پوچھا: "میں نے مزبور تو دیکھا کہ پڑھنے پر یہ تقریباً پچاس گز ہے۔ چھپے ہوئے کیا ہے۔"

اُس نے اپنی ٹوپی اٹھ کر منہ سے اٹھائی اور اشارہ کیا کہ میں نے دائرہ کبڑا دیکھا۔

وہ بہت دور سے پہلے رہا تھا مگر کوئی کاروبار نہ کرتے ہوئے۔ اس کے ہاتھ پر بہت

پسینہ بہ رہا تھا مگر اُس نے نہ پوچھا۔ میں نے حسوس کیا کہ ہمارے زمانہ اب دیر نہیں

گئی ہے۔ سورج کی تیش کی جتنی آگ برسی تھی۔ گرمی اب ناقابل برداشت ہو گئی

ہم سڑک کے اسی حصے سے گزرتے ہیں جس کی حال ہی میں مرمت ہوئی تھی۔ سورج کی

شعاعوں سے کوئی چمکا رہی تھی۔ اس میں ہمارے پاؤں جھنس گئے۔ جب ہم نے نور

سے انہیں کھینچنا تو جوتوں کے ساتھ کوئی بھی کھڑائی نہ دیکھی کہ کوئی ٹوپی گاتے کے

پتھر سے کی تھی۔ میں معلوم کرتا تھا کہ وہ بھی کوئی چمکا رہی تھی۔ میں نیلے اور سفید مٹی

کے تھے رنگوں کے امتزاج میں کھوسا گیا۔ کوئی کاروبار نہ کرتا تھا، انھوں نے کسی

رنگ کا گونڈی کا رنگ کاہ چکتا ہوا۔ یہ سب چیزیں۔۔۔ سورج چمکے کی دھواں

کے گھونڈ کی ہیرا دھنی کا دھواں دھرت جگے کی مکان۔ یہ سب اذیت کا باعث

تھیں اور میرے خیالات پریشان ہو رہے تھے۔ میں نے ایک دفعہ پھر مڑ کر دیکھا۔ پرز

معلوم نہیں کہ ہم نے پہنے کی تیاری میں اتنا وقت کیوں لیا۔ مجھے اپنے گہرے رنگ کے

پتروں میں بہت گہری رنگ دیکھی تھی بہت قدر بڑھے نے جواب قدر سے مسلسل چکا تھا

پھر سے اپنی فری اتاری۔ میں نو سا اس کی طرف جڑھا اور اسے کھٹا شروع کیا۔ یہ ہاتھ

میں ڈال کر کھینچنے اس کے متعلق مجھ سے کچھ کہا لیکن میں اس کی طرف دیکھتا رہا۔ مجھے یاد پڑتا

ہے کہ اس نے مجھے بتایا تھا کہ اکثر اشیاء اور سیریز پر ایک نرس کے ساتھ شام کو گاؤں

تک پہنچنے لگی جاکر کرتے تھے۔ میں نے اپنے اور دو رنگہ ڈھائی اور منظر کا جائزہ لیا مڑ کر

ایک قطار آسمان کے قریب پہاڑوں تک ہمارے ہی تھے۔ گرم گلابی اور سبز زمردی رنگ کا

نوعی صورت مکان۔۔۔ اس میں اتنی کچھ ہنر سمجھنے کے۔ اس ملک میں شام کا یہ منظر

خواب کی طرح معلوم ہوتی ہے۔ آج سورج جو بن پر تھا۔ لہذا سفر بہت تکلیف نہ دے

پر مڑ رہا۔

آخر کار ہم نے چٹا شروع کر دیا۔ اس وقت میں نے دیکھا کہ پرز ہکا ہکا

لنگر رہا ہے۔ بہت گاڑی کی رفتار تیز ہو گئی تھی اور یہ بڑھتا چھپے ہو گیا۔

آدمیوں میں سے بھی جو گاڑی کے گرد چل رہے تھے ایک پیچھے ہو گیا۔ اب وہ میرے

ساتھ چل رہا تھا۔ میں جانتی تھا کہ سورج کی تیز رفتاری سے آسمان پر جڑھ رہا تھا۔ یہی

نے نو کیا کہ بہت دیر تک گاؤں کے گرد وفاق میں کپڑوں کوڑوں کے گانے اور گھاس

کی گرم سرسراہٹ کی آواز سنائی دے رہی تھی۔ میرے گاؤں پر پسینہ بہ رہا تھا۔ چونکہ

میرے پاس ٹوپی نہ تھی میں اپنے آپ کو دوں سے ہراکتا رہا۔ جائزہ برآمد ہوا

سے مجھے کچھ کہا مگر مجھے سنا ہی نہ آیا۔ ساتھ ہی اُس نے ایک ٹوکڑا سے جو اُس کے

ہاتھ اٹھائیں تھا اپنے سر سے پسینہ پونچھا۔ دانتی اٹھ سے وہ تباہی کو کوٹنے سے

مجھے ڈر نہ معلوم ہو رہا تھا۔ گرئی اور گرد کی دھندل مٹش میں کھو ہوا میری نظروں نے اُسے بہت دھندلا مگر سہجی میں اُسے نہ دیکھ سکا۔ میں نے سوچا کہ اُمی نے شُرک سے ہٹ کر کھیتوں کی راہ سے لی ہے۔ میں نے یہ بھی دیکھا کہ ذرا آگے ہمارے سامنے شُرک کا موڑ تھا۔ میں سمجھا کہ پر پڑ جواسی علاقے کو خوب جانتا ہے۔ رستہ کاٹ کر ہم سے آگے موڑ پڑ آئے گا۔ چنانچہ یہی ہوا مگر وہ پھر غائب ہو گیا۔ وہ دوسرے کھیتوں کے پار گیا اور کئی دفعات میں نے یہی حرکت کی۔ اب مجھے محسوس ہوا کہ خون کی مدت سے میری کچھ پیٹھ جا رہی ہے۔ اس کے بعد کے واقعات کچھ ایسی رفتار سے گزرے کہ مجھے کچھ یاد نہ رہا۔ صرف ایک بات یاد ہے۔ وہ بات جرنیل نے مجھ سے گاؤں میں داخل ہوتے ہوئے کہا تھی۔ اس کی آواز عجیب و غریب سچی اور اسی کی کچھ نسبت اُس کے چہرے سے نہ لگتی۔ ایک لڑتی ہوئی شری آواز۔ اُس نے مجھ سے کہا تھا:

”اگر انسان آہستہ چلے تو کوئل جانے کا خطرہ ہے اور اگر تیز چلے تو پیٹنے سے بچان ہو جاتا ہے اور گرے کی گھڑی ہوا میں لوگ مرنے کا اندیشہ دیتا ہے۔“ وہ بات جت کی کر گئی۔ اسی میں کوئی کام نہیں۔ میرے ذہن میں اسی سفر کے کچھ خاکے محفوظ ہیں۔ مثلاً پیر کا چہرہ جب وہ آخری دفعہ ہم سے گاؤں کے قریب آئی تھا۔ دیکھو۔ وہ کسے افسوس کی لالوں سے ٹپک رہے تھے۔ مگر چہرے کی گہری جھریاں نے انہیں پہنے نہ دیا۔ وہ آٹھونچے مگر چہرہ نہ سکے۔ صرف پھیل گئے اور پھر لی کر اس کے دیان چہرے پر انہوں نے پانی کی ایک چمک پیدا کر دی۔ پھر میرے حلقہ میں دفن کا گرجا محفوظ ہے۔ شُرک کے دور دیہ گاؤں کے لوگ قبرستان میں قبروں پر جرنیم کے شریخ پھرنے پڑے۔ کایہوش جرمانا دیکھیں کہ کشتہ چلی کا گر پڑنا، خوں رنگ زمین جو

اتنی کی اتنی پر کھود رہی تھی۔ مضیہ جڑیں مٹی میں گلاٹھ ہو رہی تھیں۔ پھر لوگوں کا نقشہ۔ ان کی آوازیں، گاؤں، قبر و خانہ کے سامنے بس کی انتظار میں ہمارا رنگ۔ موٹر کے مسلسل خراشے اور اس کے بعد میری خوشی کی کچھ انتہا نہ رہی۔ جب ہماری بس اجمیر کی روشتیوں کے سامنے ہانے میں چکی اور میں نے سوچا کہ آخر کار اب میں پورے بارہ گھنٹے تک پاؤں پیسا کر سو سکوں گا۔

اور اسی کی جگہ گھر میں اس نے کچھ نہ کیا۔ میرا جی چاہتا تھا کہ کہیں کریم میرا تو قصو نہیں ہے مگر میں نے اپنے آپ پر ضبط کیا کہ کیونکر مجھے خیال آیا کہ یہ بات تو میں پیچھے ہٹاؤں۔ افسر سے کہہ چکا ہوں۔ اب تو اس کے کوئی مصی نہیں رہے۔ بہر حال انسانی مہمیت قصور وار ہوتی ہے۔

شام تک ماری سب کچھ بھری ہوئی تھی۔ فم کے کچھ حصے ذاتی تھے مگر باقی زامی پہن تھی۔ اس کا بازو میرے بازو کے گرد تھا۔ میں اُس کی چھاتیں چمڑا تھا۔ فم ختم ہونے پر میں نے اس کا بوسہ کر لیا مگر میری طرح ہے۔ فم کے بعد دوسرے ہیں۔ اگلی۔ جب میری نیست تھی تو دوسری ہانگی تھی۔ اس نے مجھے بتایا تھا کہ اسے اپنی ناک کے پہا مانا ہے۔ اب ایک مجھے خیال آیا کہ اگر اُنی اتار کر دیں ہے۔ یہ سراج کہ مجھے کچھ کوفت ہوئی۔ مجھے اتار کا دن پسند نہیں۔ میں غیر بہترین ٹوٹ گیا۔ بیکریں مجھے ملک کی اس خوش بختی کا تھی اور جو کہ کے بال اور دھڑکتے تھے۔ میں بیس دس بجے تک سوتا رہا۔ پھر دوپہر تک بیٹھے بیٹھے گریٹ تیار رہا۔ معمول کے خلاف آج میں سلسلہ کے یہاں کھانا نہیں کھا تھا۔ پتا تھا۔ دو ٹیٹا کھجور سے سوال کر رہا تھا اور مجھے یہ پسند نہیں۔ میں نے اپنے لئے اڈے تھے اور اسی پیش میں انہیں روٹی کے بغیر کھا گیا۔ مگر میں روٹی نہیں کھا اور میں روٹی بیٹھے بیچے نہیں جانا چاہتا تھا۔

دوپہر کے کھانے کے بعد میں بارہ سا ہو گیا اور کمرے میں بیٹھ گیا۔ جب اتنی یہاں تھیں تو گھر میں ہر طرف آرام تھا۔ اب میری ضروریات کے لئے یہ بہت بڑا ہے۔ مجھے چاہئے کہ کھانے کی چیز کھانے کے کمرے سے اپنے کمرے میں اٹھا لائیں۔ میری زندگی صرف اسی کمرے میں گزرتی ہے۔ گرمیوں کی حالت خستہ ہے۔ انداز کا ٹیٹھ پہلا چڑ گیا ہے۔

یہاں ایک سنگار میز اور ایک ٹائپنگ کا کچھ بڑا ہمارا ہے۔ باقی سب چیزیں میرے لئے ناکارہ ہیں کچھ دیر بعد وقت گزارنے کے لئے میں نے ایک پرائمر مارا اٹھا دیا اور اسے پڑھا۔ فم میں نے اس میں سے اشتہار کاٹا اور اپنی پرائمر کی میں چسکا دیا۔ میں اس کو پی بیٹا ہوتا کے قسمت لڑائے اپنی دلچسپی کے لئے جمع کیا کرتا تھا۔ میں نے ہاتھ نہ لگو دھو لیا اور باخبر باخبر میں جا بیٹھا۔

شیر کے فوج میں میرا کمرہ ایک شاہزادہ پر تھا۔ سر پہر کر موسم اچھا تھا۔ مگر پتھر کی عمارت کا ہوسور تھی۔ لوگ خالی خالی نظر آتے تھے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ بہت جلدی میں ہیں۔ ایک پورا خانہ اپنی پہلی قہقہے سے نکلا تھا۔ دو چھوٹے چھوٹے غائبی ایک کالوں پیچھے جڑے تھے۔ بیکر کھنڈوں کے اوپر تک۔ خستہ پڑاؤ میں خود اگڑا کر کمر چل رہے تھے۔ ایک بچی بڑی سی گولی لٹائی لٹکتے ہوئے تھی۔ اس کے کالے جڑے پائوں سے خوب چمک رہے تھے۔ ان کے پیچھے پیچھے ان کی سوائی مائی ترمزی رنگ کے بیٹھی لاس میں اور باپ ایک ڈوبتا بہت قدامت میں کو میں صرف صورت سے پہچانتا تھا۔ اس کی پٹائی تھی کی صورت تھی اور اس کے اندر میں چھڑتی تھی۔ اس کو اپنی اتنی کے ساتھ دیکھ کر بھی سمجھ میں آتا تھا کہ اس علاقہ کے لوگ کیوں اسے ایک نامدار آدمی کے خطاب سے یاد کرتے تھے۔ مغلوی دور بعد مجھے کے نوجوانی لڑکے ملک کے گزرے۔ بانون میں تین سال بڑا تھا۔ لال رنگ کی کھٹیاں پہنے ہوئے۔ کوٹ بہت چست تھی پر گشتہ کاروی ہوا ہے جی تھی اور جڑے سامنے سے سر پہن شکل کے۔ میں نے سوچا کہ وہ مرکز کے سینا میں جا رہے ہیں۔ اس لئے وہ تیری سے شام کی طرف جا رہے تھے اور خوب زور زد سے نہیں رہے تھے۔

ان کے جانے کے بعد ملک اہستہ اہستہ سستا ہو گیا۔ میرا خیال ہے کہ فم

شہر بھر گڑھ بن چکے تھے۔ اب شاہراہ پر مرنے والے اور خرابے والے رہ گئے تھے۔ معلقین صاف تھا، انجیر کے درختوں پر درودیدہ سڑک کے کنارے کار سے لگے ہوئے تھے۔ سوچ زیادہ نہیں چل سکتا تھا۔ گلی کے اس پار سڑک کی ڈیڑھی پر سٹاک ڈروٹ نے بند کڑھی نکالی۔ اسے کھول کر اپنے دروازے کے پاس رکھ دیا۔ وہ انجیریں سمیٹ کر گریس کی کشت پر بازو دکھا کر کھڑا گیا۔ شام جو ٹھنڈا ہو گیا۔ کچھ گھبرائی۔ سچے سچے اب تقریباً خالی تھا۔ ایک چھوٹے سے قبوہ نما عمارت پر سٹاک ڈروٹ کے بازو ہیں، ایک لڑکا خالی مکان میں جھپٹا دے رہا تھا۔ یہ واقعی خاصا توار کا دن تھا۔

میں نے اپنی کرسی کا فرش پھیرا اور اس کو تباہ و فساد کی کرسی کی طرح اشارہ کیا۔ میں نے صوفیوں کو یاد دلایا کہ آرام و راحت میں سے وہ دگرگٹ پیتے۔ چاکلیٹ کو ایک ٹکڑا دینے کے لئے اندر گئی اور کھڑکی پر ہی اسے کھانے بیٹھ گئی۔ تھوڑی دیر بعد وہ کھانا تیار کیا ہو گیا اور میں نے سوچا کہ گرمیوں کی کاندھنی پہنے والی ہے مگر بادل آج آجبت آجبت چھٹ گئے۔ بجائے ہونے والوں کا سایہ مگر پر پڑنا تو تاریکی چھان جاتی۔ اب بارش کی امید کم تھی۔ میں بہت دیر تک آسمان کو نگہتا رہا۔ پھر پانچ بجے ٹرائیں نہ تھکتے آپہنچیں۔ وہ مگر کمرے کے باہر والے ٹیبلیم سے تھکا خیموں کے جھنڈے کے دروازے پر تھکیں۔ پانچ بجے آنے والی ٹرائیں کھڑکیوں کو لائیں۔ لاری تھکیں۔ وہ خوب چٹا رہے تھے۔ گلا پوٹ پھاڑ کر گھر آئے تھے اور اپنی جگہ کے لئے نہ بادل کے افسر سے تھکا رہے تھے۔ بہتر نے مجھے اشارہ کئے۔ ایک موبیلا:

۱۔ سمجھت ہو:

میں نے سر ہلاتے ہوئے کہا:

۴۰ شمس المصطفیٰ

اس کے بعد بہت سی ذاتی سرگرمیوں میں جتنا مشغول ہو گیا۔
دن دراز ادا ہو گیا۔ بالآخر یہ سرگرمی سہنے کی اور ختم ہو گئی۔ جس سرگرمی پر چل کر مشغول
ہو گیا۔ لوگ مہربان ہوئے اور شکرگست کرنے لگے۔ شہزاد اور لوگوں کے یہی تھے اس شہزاد
شخصیت کو بھی دیکھا۔ ان کے بچے، بیچے، بیچے، بیچے اور داتے ہوئے آ رہے تھے۔
اس وقت عاتق کے سینہ غامی ہوئے اور تماشائوں کا ایک ٹولہ ان سرگرمیوں پر نمودار ہوا اور
ان کے سب معمول بڑے زور سے ایک نیکو گئی انداز میں شہزادہ کے گرد رہے تھے۔ جس سے
سوا کے وہ کوئی دہائی والی غم دیکھ کر آئے تھے۔ جو لوگ ان کے سینہ سے لڑتے تھے
وہ زور سے پہنچے۔ وہ بہت تھیں اور سنیہ، معلوم ہو رہے تھے۔ کچھ بھی کھا رہے تھے
ہی تھے تو کھانے ہوئے انداز میں۔ وہ لوگ ہم سم نظر آ رہے تھے۔ وہ میرے سامنے کی
سرگرمی پر آگے پیچھے چلنے لگے۔ عاتق کی نوجوان لڑکیاں بال بے کئے ایک دوسرے کے
اقترا میں آتے دیکھ کر لیاں بنا کر ٹھیل رہی تھیں۔ چند نوجوان لڑکوں نے ان کی راہ روکی اور
کچھ فقرے کہے۔ اس پر چند لڑکیاں سر ہلا کر کہیں۔ ان میں سے دو ایک نے جنہیں میں
میرا ذاتی خاص ہی طرف دیکھا اور آواز مانی۔

اب شرک پر جان فیزی سے روشنی ہو گئے۔ قیام چھتے ہی آسمان کے ستاروں کی چمک ناند چڑھ گئی جس سے مسکایا کہ لوگوں کی بے بسار ہوا اب شرک کی روشنی دیکھ کر میری آنکھیں تنگ ہیں۔ یہی کہی ہوئی شرک روشنی سے چمک رہی تھی۔ غلاموں کی سنانے کی روشنی کھینچتے بالوں پر پٹکی۔ کبھی کسی کی مسرت بٹ ہوا کہ کسی آخری چڑھان پر ہرگز دور بعد میں کم ہوتے گئے۔ یہاں وہ دشمنوں اب شرک کے چاروں پر چھا گئی۔ یہ علاقہ

بالکل دہرائی تھا۔ یہاں تک کہ کبھی مسلمان شہزاد پر پڑے اسلام سے چھٹنے لگی۔ میں نے پھر صبر و
کرباب کھانا کھانا چاہئے۔ امیر کوئی گروہ میں خزانہ چاہیگا۔ تھوڑے گروہ میں بہت دیر تک گروہ
کی کشت پر سر جھکا کر بیٹھا رہتا۔ روٹی خریدنے نیچے اتار میں نے کھانا کھا یا اور پھر وہاں
کھڑے کھڑے کیا۔ یہاں جہاں کھانے کی کھانے میں بیٹھ کر گھر میں بیٹھ کر گھر میں بیٹھ کر گھر میں بیٹھ کر
مجھے کچھ شہزادہ کی موسیٰ ہونے لگی تھی جس نے کھانے کو بنا کر دیں اور کھاتے ہوئے میں نے
انہیں یہ دیکھ کر امیر کی ٹانہیں میرے کنارے روٹی کے چمکے کھانے کے ساتھ چڑی چڑی
ہے۔

مجھے خیال آیا کہ خدا خدا کر کے اُفراقِ ختم ہوا۔ اقرارِ پیشیا ہے جو خدا کی
جوتہ ہے۔ اور یہ بھی خیال آیا کہ اب اُفراقِ کون کر دیا گیا ہے اور مجھے اب سب معمول
پھر سے کام کو فرما رہا۔ مقررہ کہ دنیا کے کام کبھی بد نہیں جرتے اور زندگی کے
کاروبار کی تغیر نہیں ہوتا۔

②

آجی میں نے دفتر میں بہت کام کیا۔ میرا افسر اچھے موڈ میں تھا۔ اس نے مجھ سے دریافت کیا کہ میں زیادہ تھکا ہوا نہیں ہوں؟ اس نے اتنی ہی عمر کی لڑکی۔ میرے ساتھ کچھ سوچا اور کہا کہ تقریباً ساڑھے برس ہو گئے ہیں۔ مجھے وہ تو معلوم نہیں مگر آئی اس کا رویہ بڑی جہد و جدوجہد خوار کی کا تھا اور اندازاً کچھ یوں تھا کہ اب وضع کو خیر یا بد کہہ سکتے ہیں۔

اس کے پاس شوق کا ایک انداز تھا جو اس کے میز پر دو میز کو بار بار مڑتی تھا کہ وہ
 ان سب سے میٹر۔ وہ ہر کچھ کھانے پر جانے سے پہلے ہی نے ہفتہ دھوئے۔ وہ پھر
 کا یہ وقت مجھے بہت پسند ہے۔ شام کو مٹھن کم ۱۲ سے کیونکہ گھر گھومنے والا تو میرا جیسو بھی
 استعمال کرتے ہیں بالکل کیا ہو جاتا ہے۔ وہ سارا وہی چراغ استعمال کرتا تھا ہے۔ میں نے
 اپنے افسر سے ایک روز اس کا تذکرہ کیا۔ اُس نے مجھے جواب دیا کہ اس کے نزدیک
 یہ بات اچھی تو نہیں مگر بہر حال ایک فرائض تکمیل ہے۔ میں معمول سے فوراً دیر سے نکلا مگر
 بارہ بجے، ایمپل کے ساتھ جو جہاز پر مال پر سنانے کا کام کرتا تھا۔ دفتر مستند کے
 کنارے تھا۔ بزرگ وہ جن دو صوبوں میں تیر رہی تھی، ہم نے کچھ وقت لگا ہوا مال بھیجے

میں سناٹے کیا۔ اسی لمحہ ایک بڑی لاری زنجیروں اور انجی کے دو سہاگوں کا شور و غل کرتی ہوئی آ
چنپی۔ ایستول نے جھوٹے پرچھا:

”میلو گئے اسی پر“

اور میں نے دوڑنا شروع کر دیا۔ لاری چار سو پانچ سو گزری تو ہم نے ایک
تغاب کیا۔ یہ شور اگرمی اور گرو کی پیٹ میں آگیا۔ مجھے اب کچھ نہیں یاد تھا صرف
اُس کے کُتیب و فز اور لاری کے چمکے محسوس چور سے تھے۔ یہی کچھ جتنی پر
تلقین رہے تھے اور باوہانی کشمکش تیزی سے ہمارے پاس سے گزر رہی تھیں۔ میں نے
پچھتوٹ کر کوئی چیز سے جان بوا اور پر ایک چمکنا لگا کر اس میں سوار ہو گیا اور پھر
میں نے ایمنوں کو اُپر کھینچ دیا۔ ہمارا سامنی پتھر لا ہوا تھا۔ اُن کو گھما کر کی کہ ہوا اور پتھر کی پتھر
پر اچھل رہا تھا۔ گری بہت تھی اور مٹی خوب اُڑ رہی تھی۔ ایمنوں کا ہنسنے کے مارے دم
لگے۔

ہم حسین میں شرا اور سلیط کے رسترواں پر پہنچے۔ وہ ہمیشہ وہاں سے کے
ساتھ اپنی خاص جگہ پر کھڑا ہوتا، تو اُن کے ہرے، بھڑائی پکڑے ہرے اور اپنی
سفید موٹھوں کو تار دیتے ہرے۔ اُس نے ہرے پر چڑھا:
"کمان لگ دوں؟"

محمد علی

ہاں! مجھے ٹھوکر لگی ہوئی ہے!

میں نے بہت جلدی سے گھما لکھنیا اور آخر میں تھوڑا پیچ میں اپنے بیان
 دہانے میں دم بخود کر کے کوکڑھیں گھور کر شراب ڈلوانے والی تھا۔ اسے مجھے

تاریخ کا طلب چاہی۔ یہ ہر بچہ کی عقلی اور جسمانی پرورش کو بہتر بنانے کے کام آیا۔
 دوسری بڑی کامیابی تھی۔ شام کو نکلتے ہوئے گھاٹ کے کنارے جہاں قادی کر کے کھانے کا
 خوب مزہ آیا۔ آسمان بڑھتا اور میں بڑے اطمینان سے قضا پھر میں یہ جگہ گھر آیا
 کہہ کر مجھے اچھے ہوئے آگاہا کرتے۔

ان میں اندر اترتا۔ بڑے صباں چڑھتے ہوئے جب سے سلاو سے میری مدد طلب ہوئی۔ وہ میرا ہمسایہ تھا۔ اس کو ان کا حسب معمول اس کے ساتھ تھا۔ اس کو بڑی سے میں انہیں بہیم دیکھ رہا ہوں۔ ان کو کھانسی لگنا بہت بعد تھا۔ اس کو جلد کی کوئی بیماری تھی۔ میرے خیال میں اس کو خارش تھی جس کی وجہ سے اس کے سارے بال جڑ رہے تھے۔ اس کے دماغ پر گندہ کی رنگ کا کھنکھارہ تھا۔ دونوں کو ایک ساتھ ہی جوڑتے تھے کہ وہ یہی رہے گا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ دونوں کا فوجی اپنے ساتھ کو ہم شکل نظر آنے لگا۔ اس کے چہرے پر شرمیلی ہانکی کھنکھارہ تھا۔ اور دوسرے بال بہت کم اور پیلے پڑے تھے۔ کھنکھارے اپنے ہانکے سے ایک طرف جبکہ کر چلنے کا انداز میٹھ گیا تھا۔ ستر تھن کی ہانکی کوئی اور گروہ تو ہوتی۔ دونوں ایک ہی نسل کے معلوم ہوتے تھے۔ گروہ دونوں کو ایک دوسرے سے آگے اپنی باہر تھا۔ دونوں نے دوبارہ دیکھا۔ بچہ اور چھ بچے جڑا کر کے کہلاتا فرنگھانے سے جاتا۔ باہر کی سے انہوں نے اپنا یہ معمول نہ دلا تھا۔ بہرہ دونوں آدمی انہیں وہاں کی شڑک کے کنارے دیکھ سکتا تھا۔ گتا اسے زور سے گھسیٹتا جاتا۔ ستر کی بڑھ کے قدم دنگا جاتے اور اسے شڑک لگتی۔ پھر وہ کھنکھاتا کھنکھاتا اور گایاں کہتے۔ گتا آخر سے سمجھ جاتا اور وہ اسے گھسیٹتے گھنکھاتا۔ اب بڑھانے کو کھینکتا۔ جب گتا بھول گیا گاؤں کی کیا گت بنی ہے وہ پھر اپنی حرکت خروار کو دہرا اور بڑھا پھرتے۔ پشیا اور گایاں کہتے۔ پھر وہ دونوں پیدل چلنے

والوں کے راستے پر گھر سے ہوجاتے اور ایک دوسرے کو گھومنے لگتے۔ شام غروب سے
اور آدمی لغزت سے رہ رہ کر ڈھکی تماشہ ہوتا۔ جب کتا کچھ کے ساتھ پیشاب کرنا چاہتا جڑھا
اُسے دنگے نہ دیتا۔ وہ اسے گھسیٹتا اور بے چارہ کتا چلتے چلتے پیشاب کرنا اور تھوڑوں کی
قطار بنانا چاہتا تھا اور اگر اتفاق سے وہ کبھی یہ حرکت کرے تو میری کیفیت تو پھر سے پشیمان
آخر برکت سے یہی سلسلہ جاری تھا۔ سلسلہ ہمیشہ کھتا:

”یہ بڑی بد بختی ہے۔“
گھر اس بات کی تکرار کرتی رہتی رہتی۔

جیسے پھر یہی دلیں اُس سے میری فکر ہوئی تو مسلمان اپنے کتے کو برا بھلا کہنے میں
مشغول تھا۔ وہ اسے کبیر لانا تھا۔

”خامی — سور“

اور کتا دور لانا تھا۔ میں نے آداب و فضائل کی نیکی بڑے مسلسل گامیوں میں رہا پھر
تو چھوڑ کر آنکھ سے اُس کا کیا بگاڑا ہے۔ مگر اُس نے پھر جواب نہ دیا۔ وہ صرف یہ کہتا
رہا۔ ”خامی — سور“

میں نے دیکھا کہ وہ کتے پر جھگڑتے ہوئے اُس کے پٹے کی کوئی چیز ٹھیک کرنے لگا
ہے۔ یہی سنہ اُسے اور خندا دانہ سے پکڑا تو میری طرف حراسے بغیر اُس نے ایک بے چارے
فصیح سے کہا:

”یہ ہمیشہ دستبر آہمکتا ہے۔“

پھر وہ جانور کو کھینچتے ہوئے اوپر چلا گیا۔ کتا اپنے چاروں پاؤں پر گھسیٹے گھسیٹے
بلک رہا تھا۔ یہی اس وقت ہماری منزل پر دھننے والا دوسرا ہمایہ نمودار ہو گیا۔ علاقے کے

لوگ کہتے تھے کہ وہ مردوں کی آمدنی پر گزارا کرتا ہے۔ جب کوئی کس سے پوچھتا کہ اسی کو پیش
کیا ہے تو وہ کہتا:

”وہاں داری!“

عمر ماہ مشکل سے ہی کسی کو خاطر میں لانا تھا لیکن وہ مجھ سے اکثر باتیں کیا کرتا۔
اور کبھی کبھار کچھ وقت میرے بیان گزارتا کہ میری اُس کی باتیں ہی قیامت تھا۔ وہ حقیقت وہ
مجھے بہت دلچسپ آدمی معلوم ہوتا تھا۔ ہر حال کوئی ایسی وجہ نہ تھی کہ میں اُس سے بات
نہ کرتا۔ اُس کا نام راجن تھا۔ وہ خاصا چست تھا۔ اُس کے کندھے پر چڑھے چمکے
تھے اور اُس کی ناک گھرناس بازی کرنے والوں کی طرح چپٹی تھی۔ اس کا باسی ہمیشہ موڑوں
چوتا رہتا۔ نوکانہ کرہ کرتے ہوئے اُس نے بھی مجھ سے کہا تھا:

”کیا یہ بڑی بد بختی نہیں ہے کہ وہ کتے سے یوں ملوک کرتا ہے!“

اُس نے مجھ سے پوچھا کہ اُس کی وجہ سے مجھے کوفت تو نہیں ہوئی ہیں نے کیا نہیں
ہم ایک ساتھ بیڑیوں میں رہتے رہتے اور میں اس سے اجازت لینے ہی والا تھا کہ
اُس نے کہا:

”میرے یہاں کچھ خورد و نوش کا سامان ہے۔ ایک نوکانہ کھائیں گے آپ میرے
ساتھ۔“

میں نے یہ سوچتے ہوئے کہ کھانا پکانے کی مصیبت ٹل جاتے گی ڈن کر دی۔
اُس کے پاس بھی ایک بیکری تھا جس میں کھانے کی چیز ایک بار چھی غارتھا۔ اُس کے چنگ
کے اوپر دیوار پر ایک زخمت سفید اور گلابی گچ کا بنا ہوا رنگ رہا تھا کچھ پہاڑوں کی
تصویریں اور دو تین گلی حورتوں کے تاشے۔ مکرہ کیفیت تھا اور ہر گاہ ہر انہیں تھا۔ اُس

”اب نے دیکھا میں نے اُس کو چاہا میں کیا کر دو میرے پیچھے چلا جاتا تھا۔ اُس نے مجھ سے کہا۔“

”میں نے سر ہلادیا۔ پھر اُس نے کہا:

”یہ سچ بات تھی اور میں اُسے پہچانتا تھا۔“

پھر اُس نے اعلان کیا کہ واصل اس معاملہ میں وہ میری رائے معلوم کرنا چاہتا ہے کیونکہ میں ایک چاندیہ آہی ہوں اور اُس کی مدد کر سکتا ہوں۔ پھر وہ قورامی میرا پتہ بتا دیں جانے لگا۔ میں چُپ رہا اور اُس نے تکرار سے مجھ سے پوچھا کہ کیا میں اُن کا ہم فائدہ پہنچاؤں جتنا چاہتا ہوں۔ میں نے کہا:

”میرے لئے سب برابر ہے۔“

وہ طعنیہ معلوم ہوتا تھا۔ اُس نے کلام طرہ نکالا۔ اُسے کڑھائی میں بنایا اور گھول بیٹھا اور انگوڑی خراب کی دو توبہ میں بند کر دیا۔ سب خاموشی سے۔ پھر ہم چم کر بیٹھ گئے۔ کھاتے ہوئے اُس نے اپنی کہانی متانی شروع کی۔ پہلے وہ کچھ جھجکا۔

”میں ایک عورت کو جانتا ہوں۔ یوں کہنے کے وہ میری داستان ہے۔ وہ آج بھی سے اُس کی لڑائی چوٹی تھی اس عورت کا بھائی تھا۔ اُس نے مجھے بتایا کہ وہ اُس کی مالا مال کرتا ہے۔ میں نے کچھ جواب نہ دیا۔ تو اُس نے فرمایا:

”ملاقات میری وگ جو باتیں بتاتے ہیں اُسے سب معلوم ہیں مگر اُس کا اپنا ضمیر دیکھ ہے اور یہ صحیح ہے کہ وہ دکھا دیتی کہتا ہے۔“

”آدم برسر مطلب۔“ اُس نے مجھ سے کہا۔

”میں سمجھ گیا کہ والی میں کچھ لگا ہے۔“

نے پہلے اپنا تیل والا میپ ہلادیا۔ پھر وہ خاموش رہا۔ اپنی میپیں ٹھٹھنے لگا۔ اُس نے ایک میپ کی چٹنی نکالی اور دائیں ہاتھ کو پیٹ لی۔ میں نے پوچھا کہ کیا ہوا۔ اُس نے مجھ سے کہا کہ اُس کی لڑائی ایک ایسے (ٹاکے سے ہوئی ہے جس کا ذکر کیا نہیں میں آتا ہے۔

”اب سمجھتے ہیں میری مرضی؟“ اُس نے مجھ سے کہا، ”اُس نے نہیں کر میں نے کوئی ضرورت کی تھی کہ میں نے کوئی مافوقی گرم ہے۔ اُس آدمی نے دُور سے مجھے بلکادیا۔“

”شام سے نیچے آکر تو مر رہے۔“

”میں نے کہا:

”میں جیتا ہوں اور خوش کے فاصلے میں تیرے لیے کیا جھگڑا ہے۔“

اُس نے طعنہ دیا کہ میں مر رہا نہیں ہوں۔ پھر میں شام سے نیچے آکر اُدھ اُس سے کہا:

”بہتر ہے اب میں گرد و زہ میں تھاری جان اور دوں گا۔“

اُس نے کہا:

”کیا۔“

پھر میں نے اُس کے منہ پر ایک چیت رسید کی۔ وہ گر پڑا۔ میں اُسے اٹھانے لگا مگر اُس نے بیٹھے بیٹھے میرے پیٹ میں لاشیں ماریں۔ اس پر میں نے اُسے ایک گھٹکا دیا اور دو گھٹے مارے۔ اُس کا چہرہ۔۔۔ لہر لہاں چر گیا۔ میں نے اُس سے پوچھا کہ

”کیا اُس کا حساب کچھ کیا ہے یا نہیں؟“

اُس نے کہا۔ ”اُن۔“

میری بات کے دوران اُسوں میں خفگی کرتا رہا۔ میں ٹھیک پر بیٹھا ہوا تھا۔

”میں اُسے گزارے کی رقم دینا ہوں۔ اسی کے کمرے کا کرایہ بھی ادا کرتا ہوں۔ اور اسے روزانہ ۲۰ فرانک کھانے کا خرچ دیتا ہوں۔ مگر اسے کتنی سوزناک، اچھوس فرانک خرچ کے گاہے گاہے جرابوں کا ایک جڑا — یہ ہوتے ہزار فرانک — اور مادام کوئی کام ہی نہیں کرتی تب تک کتنی ہے کہ ہر ماہ بھی لہو بی جانتے۔ میں جیسے دیتا ہوں اس پر اُس کا گزارہ نہیں ہوتا۔ مگر میں نے اُس سے کہا کہ ہر ماہ اُسے دلی کے لئے کوئی کام کیوں نہیں کرتیں۔ اس طرح سب جھڑکی جھڑکی ٹکروں سے میرا چٹکا لڑ جاتے گا۔ اسی جینے میں نے تین ایک لباس خرید کر دیا ہے۔ میں تین روزانہ ۲۰ فرانک دیتا ہوں۔ میں تمہارا کرایہ ادا کرتا ہوں اور تم — اپنے دوستوں کے ساتھ ساری سہ پہر قبوہ آرائی ہو رہی ہو تمہیں اور شکرت دیتی ہو۔ میں تین مال دیتا ہوں۔ میں تمہارے ساتھ چلا کرتا ہوں اور اس کے بدلے میں تم میرا جراب چاہتی ہو۔ مگر وہ کوئی کام کا چیز نہیں کرتی اور ہمیشہ کتے ہی اس سے یہ دھندو نہیں ہوتا۔ اس سے مجھے شبہ ہوا کہ ہر ماہ کچھ گڑبڑ ہے۔“

اُس نے پھر مجھے بتایا کہ اُسے لڑکی کے بیک میں ایک لٹری کا گٹ تھا۔ اور وہ اُسے خاطر خواہ جراب زدے کی کڑی نے یہ کیونکر خریدیا ہے۔ منٹوڑی دیر بعد اُسے گھوڑی پر شرت میں جا کر اُس نے دو جرابیں گروی رکھ دی تھیں۔ ایک ایک تو اُس نے چڑیوں کے دو دو کو ہی نظر انداز کر رکھا تھا مگر اب مجھے صاف نظر آیا کہ سب صبر کا ہے۔ پھر میں نے اُسے چھڑ دیا مگر اس سے پہلے میں نے اُسے چنا اور خوب مسواتی سنائی۔ میں نے کہا تو صرف اپنے ذہان تنگ سے میں کرنا چاہتی ہے۔ آپ سمجھتی ہیں میری ہر سو کو میں نے اُسے یہ کیونکر کہا؟

”تم نہیں جانتی کہ دنیا تمہاری خوش نصیبی پر جتنی بھری ہو ہے حاصل ہے کتنی قدر شکرت کرتی ہے۔ تین بعد میں پتہ چلے گا کہ تم کتنی خوش نصیب ہو۔“ اُس نے عورت کو مار مار کر ہلکا کر دیا۔ پہلے وہ اسے پشیمان نہیں تھا۔

”یوں کہنے کو میں اُسے مارا تو تھا مگر ہمارے۔ وہ لٹری دیر دو لمبی میں کھڑکیا بند کر دیا اور بات ختم ہو جاتی۔ مگر اب کے بعد جینیں تھا۔ میں نے اُسے خاصی سزا دی؟“

اُس نے مجھے بتایا کہ ابھی وہ ہے کہ اُسے میرے مشورے کی ضرورت نہیں آتی ہے۔ لیپ دھواں دے رہا تھا۔ وہ اُس کا تھکے ٹھیک کرنے کے لئے لڑکا مگر میں مارا وقت کچھ کچھ بغیر اس کی بات سناتا۔ میں تمہارا ایک بوتلی شراب پی چکا تھا اور میری کپڑوں میں بہت عداوت تھی میری جیب تھی۔ میں دامن کے سگریٹ پتار رکھتا ہوں۔ اپنے سگریٹ ختم ہو گئے تھے کچھ آخری ٹوٹا ہوا ہو رہی تھیں۔ ان کا شور ہمارے علاقے سے دور ہوتا مارا تھا مگر دامن نے بات سہاری رکھی۔ جرات اسے اب پریشان کر رہی تھی۔ وہ یہ بھی کرا اُسے اب بھی اُس عورت سے جینی ٹاپ کی خواہش تھی، مگر وہ چاہتا تھا کہ اُسے جرات نک سزا دے۔

اُس نے پہلے سوچا کہ وہ اُسے ایک بوتلی میں سے جانتے اور دلی شریف آدمیوں کو بلا کر اُن کے سامنے اُسے ذلیل اور سا کرے۔ اُس کا خیال تھا کہ وہ پوریس کو سزا دے گا کہ اُس کا کام بازاری عورتوں کے جبر میں درج کر دے۔ فوراً ہی اُس نے اگلے کے چند نمونوں کو دیکھا۔ اپنے دوست جو عورتوں کی آؤٹی پر گزارا کرتے تھے ان کی سمجھ میں بات نہ آئی۔ جیسے کہ انہوں نے جملہ کہا اس کو روک دیا میں دہن ہی غلاب

اور ایک طرح سے یہ بات ٹھیک بھی تھی۔ مجھے پسند آ رہی تھی اور اٹھنا نصیحت معلوم ہو رہا تھا۔ میں مژدہ تھا ہوا نظر آتا ہوں گا کیونکہ راسوں نے کہا کہ تم زیادہ نہیں کرنا چاہئے۔ پہلے تو میں بات نہ سمجھ سکا۔ مجھے اُس نے کہا کہ اُسے معلوم ہے کہ اتنی فوٹ ہر جگہ ہے لیکن یہ تو ایک حادثہ ہے جو ہر ایک کو ایک ذائقہ دی ہوگا آتا ہے۔ یہی نئے پرنس بھی تھی۔

میں اٹھا۔ راسوں نے بڑے خوش سے میرے ساتھ ساتھ دیا اور کہا: 'مرد ہمیشہ ایک دوسرے کو خوب سمجھتے ہیں'۔

اس کے بیان سے نکلنے پر تھے میں نے دو دنہ بد کیا اور دم بھر بیڑھیوں پر اندھیرے میں کھڑا رہا۔ ساری بیڈنگ خاموشی تھی۔ بیڑھیوں کے بیچوں کی گہرائی میں سے مرطوب ہوا اُپر آ رہی تھی۔ مجھے صرف اپنے خون کی حرکت کانوں میں سائیں گائی کرتی لگتی تھی۔ میں سکت کھڑا رہا۔ بڑے مسلمان کے کمرے سے کتنے کی آہستہ آہستہ جگنے کی آواز ابھی تک آ رہی تھی۔ ایک بھول کی طرح جو خاموشی اور اندھیرے سے بھر جاتا ہے۔

(۴)

میں نے سارا ہفتہ دفتر میں خوب کام کیا۔ راسوں ایک مرتبہ مجھ سے ملنے آیا اور اُس نے کہا کہ اُس نے خط لکھی دیا ہے۔ میں دو دفعہ بیٹھوں کے ساتھ بیٹھ گیا۔ اس کے کچھ تپے نہ چڑھا کر کیا ہو رہا ہے۔ سارا وقت سمجھنا پڑتا تھا۔ کل منیجر تھا۔ ماری جیسے کہ ہم نے ملے کیا تھا میرے یہاں آئی۔ اُسے دیکھتے ہی میری طبیعت اُس پر آگئی۔ کیونکہ وہ ایک نر جھوٹا شریف و سفید دھارہ دار ہی نہیں تھی جیسے کہ ہوتے تھے اور ایک بیڑھیوں کی سیٹھان۔ اس کی سیٹھان چھ تھانیاں تھیں۔ ہر ایک بیڑھیوں کی طبیعت اُس پر آگئی۔ گئے۔ بیڑھیوں کی طرح کھنکھرتا تھا۔ ہم نے ایک ہی بیڑھیوں کی آواز میرے منہ کو میسر نہ ہو سکی گئی۔ مسند کے کنارے بیٹھوں کے درمیان زمینی پر جہاں گیس کی آگ جوتی تھی بیٹھ گئے۔ پھر سچے صوبہ زیدو تیار نہیں رہتی تھی۔ گریڈ کی جگہ سا گرم تھا۔ مسند کی حیدر کی جوتی بیڑھیوں کی آواز سنست تھیں۔ ماری نے مجھ ایک نیا کھیل سکھایا۔ بیڑھیوں کے اُپر تھاتے ہر کے پانی پینا۔ ماری جھاگ مزہ میں جوت کرنا اور پشت کے بل لیٹ کر فوٹا اسی کو اُصان کی طرف حرکت دینا۔ جیسے جھاگ کی ایک جھاگ اس کی جاتی جو جھاگ کی جوتی یا بیڑھیوں پر گرم گرم بارش کی طرح آکر چڑتی۔ مگر کچھ وقت کے بعد میز منہ ملک کی تھی سے جل گیا۔ پھر ماری میرے پاس

آئی اور پانی میں مجھ سے چپک گئی۔ اُمس نے اپنا منہ میرے منہ پر رکھ دیا۔ اُمس کی زبان نے میرے ہونٹ تازہ کئے اور ہم کچھ عرصہ لہروں میں لہرتے رہے۔

جب ہم سمندر کے کنارے کھڑے کپڑے بدل رہے تھے ماری مجھے کچھ انگلیوں سے دیکھتی رہی۔ میں نے اُمس کا بوسہ لے لیا۔ اس کے بعد کچھ عرصہ ہم نے کوئی بات نہ کی۔ میں نے اُسے اپنے ساتھ چٹا دیا۔ ہم جلدی میں تھے کہ کس نے اور ہم گھر واپس اور سمندر میں دراز ہر جا میں۔ میں اپنی کھڑکی کھول آیا تھا اور یہ اچھا ہے، دیکھو کہ اب گرمی کی لہر ہمارے سنوارا ہے جو ہر جسم کو ٹھنڈک پہنچا رہی تھی۔

صبح ماری لگ گئی اور میں نے اُمس سے کہا کہ ہم اکٹھے ناشتہ کریں گے۔ وہ ہاں گئی۔ میں گوشت خریدنے نیچے اتر گیا۔ واپسی پر اُوپر آتے ہوئے میں نے رمیوں کے کمرے میں ایک عورت کی آواز سنی۔ مٹھڑی پر بعد بڑھے سے مسلمانوں نے اپنے کتے کو گالی کی۔ ہم نے مٹھڑی کی میز میزوں پر بنجوں اور تھوکوں کی آواز سنی اور پھر حرام۔ ننگ حرام کہتے کہتے دھج گئی میں نکل گئے۔

میں نے ماری کو بڑھے کا قصد نہ کیا اور وہ سنبھلی۔ اُمس نے میرا ایک پا جا سر سوٹ نہیں رکھا تھا اور اپنی آستینیں چڑھا رکھی تھیں۔ جب وہ ہنسی تو کچھ میری طبیعت اس پر اُٹھی۔ ایک عرصہ بعد اُمس نے مجھے پوچھا کہ کیا میں اُسے چار کرنا ہوں؟ میں نے کہنا۔

یہ تو ایک بے معنی سی بات ہے مگر یوں معلوم ہوتا ہے کہ نہیں۔ یہ بات سنی کہ اُمس کے چہرے پر اداسی چھا گئی۔ مگر ناشتہ تیار کرتے ہوئے اُمس کی طبیعت سنبھلی اور وہ بلا وجہ کچھ اس طرح ہنسی کہ میں نے اُمس کا بوسہ لے لیا۔ میں نے

وقت رمیوں کے میدان اڑانی جھگڑے کو شروع کیا۔

پچھلے ایک عورت کی کرخت اور جفا آواز سنائی دی اور پھر رمیوں کی آواز آئی۔ وہ کہہ رہا تھا:

"تم نے مجھے چھو دیا ہے۔ تم نے میرا ساتھ چھوڑ دیا۔ میں تمہیں جتن کھھاؤں گا۔ بہت شرور دل ہمارا عورت جیتنے جاتی رہی۔ مگر کچھ سی جوانا کہ اندازے کو فوراً غلط کے سب لوگ جھٹ کر گئے۔ ماری اور میں جی باہر نکلے۔ عورت مسلسل رو رہی تھی اور رمیوں اُسے سخت تر پیٹ رہا تھا۔ ماری نے جھوٹ کہا کہ یہ تو بڑا غم ہے اور میں نے کچھ جواب دیا۔ اُمس نے کہا کہ میں پوچھوں کہ جو آدمی نے کہا کہ مجھے سپاہی اچھے نہیں لگتے۔ بہر حال ایک پوسٹ والا ایک کو ایڈ وار کے ساتھ جوا ایک فی سائڈ تھا اور دوسری منزل پر رہتا تھا آج پہنچا۔ اُمس نے دروازہ کھٹکھٹایا مگر جواب نہ ملا۔ اُمس نے مٹھڑی پر بعد از در سے دروازہ کھٹکھٹایا۔ عورت رو رہی تھی اور رمیوں نے دروازہ کھول دیا۔ اُمس نے رمیوں کی گھٹکھٹکھٹک دیا تھا اور انداز کچھ ایسا لگتی تھی جیسے کچھ جوا ہی نہیں۔ وہ کی جھٹ دروازے کے باہر نکلی اور پوسٹ والے کو کہا کہ رمیوں نے اُمس کی چٹائی کی ہے۔

"تمہارا نام؟" سپاہی نے پوچھا۔

رمیوں نے جواب دیا۔

"منہ سے گھٹکھٹکھٹکھٹکھٹک اور پھر بات کرو۔ سپاہی گرجا۔

کیونکہ جھگڑا، میری طرف دیکھا اور گھٹکھٹک کا ایک گش لگایا۔ اب سپاہی نے پار کی طاقت کے ساتھ تڑاخی سے اُمس کے منہ پر ایک ٹھانچہ ماریا۔ گھٹکھٹک گرجا اور جاگرا۔ رمیوں کا چہرہ اتر گیا مگر اسی وقت وہ خاموش رہا۔ بعد میں بڑی عاجزانہ آواز

میں اُس نے پوچھا کہ کیا وہ سگریٹ کھانکڑا اٹھا سکتا ہے؟

سیاحی نے کہا کہ ہاں، مگر ساتھ ہی کہا،

انگل رنعت تہیں یاد رہے گا کہ سیاہی کوئی کشتہ تلی نہیں ہوتا۔

اسی اثنا میں رٹکی روتی رہی اور دہرائی رہی :

یہ مجھے پتہ ہے۔ یہ بزدلی ہے۔ یہ عورتوں کی دماغی کرتا ہے۔

پھر انہوں نے سیاہی سے کہا:

خود ادا صاحب، کسی آدمی کو گناہوں کے سامنے، ذلیل کہتا ہے۔ اس کے مطابق ہے:

نیکھیں میاں سبھی نے اسے منہ بند رکھنے کا حکم دیا۔ یہ میرا میرا لڑکائی کی طرف مٹاؤ۔

گوئی کہ تم کو کیا ہے :

دعوتی تہذیب اور انصاف کا یہی سبب جو شہر کے لوگوں کو اکٹھا کرتا ہے۔

سپا ہی نے اُمی سے کہا :

کچھ ایسا نہ کرو، لڑکی میرے ساتھ جا رہی ہے اور تم ایسی وقت تک کرے

میں رہو، جب تک تمہارے میں کارروائی مکمل نہیں ہو جاتی :-

اس لئے مزید کہا:

تعبیر شرم آئی یا بجے کراخہ درست ہو گئے ہو کہ لا پٹے نہ ہو بہت؟

24

اس وقت یہیوں سے کہا،

میں دوست نہیں ہوں تو لڑ رہا ہے۔ میں آپ کے سامنے ہوں اور صرف

اسی وجہ سے کانپ رہے ہیں۔

میں نے اپنا دوزخ و بد کیا اور مارے لوگ چھ گئے۔ مری اور میں نے ہانتہ تیار کیا۔ گھڑاے بھوکہ نہ تھی۔ سارا میں ہی میٹ کر گیا۔ دو ایک بجے چل گئی اور میری تھوڑی سی سڑک۔

قیوم بیچ کے قریب کسی نے میرے دروازے پر دستک دی اور یوں اندر داخل
ہوا اور میں نے اُس سے پوچھا کہ اُس پر کیا ہتھی ہے۔ اُس نے بتایا کہ اُس نے صوبہ
مظفر سب کام کیا لیکن اتفاقاً یہ آئی چڑی کہ عورت نے اُسے ایک غلام بچہ مارا اور پھر اُس
نے بھی اُسے پیٹ ڈالا۔ اُس کے علاوہ جو ہوا اور میں دیکھیں جس چاکہ چرن۔ میں نے اُسے
کھسکا:

میری رائے میں اب حدت کو کافی سزا دی چکی ہے لہذا اب معاملہ رفیع و رفیع ہو جاتا ہے۔

یہی اُن کی رائے تھی۔ اُن نے کہا:

”سچا ہی نے خواہ مخواہ وقت ضائع کیا۔ میں نے ہر حال میں بھر سکے اس کی عزت کر
ہی ڈالی تھی :“

اُن نے فریاد کیا کہ وہ پوچھیں کہ خوب پہتا تھا ہے اور اُن سے پتہ چلتا ہے کہ اُن
نے چہرہ مجھ سے چھپ کر کیا کیا سوچا تھا جب اُن نے سیاہی کو جہانِ گھومندِ رسید کیا تھا۔
میں نے جواب دیا:

”ہمیں دلوں نہیں تھا اور ہر حال مجھے سپاہی پسند نہیں۔“

دریوں بہت مطمئن معلوم ہوتا تھا۔ انہوں نے مجھ سے پوچھا کہ کیا میں ان کے ساتھ باہر میزگشت کے لئے چوں گا۔ میں بستر سے اٹھ کھڑا ہوا۔ باہر کو نکلتی کرنا شروع کر

وہ ریمیں نے مجھ سے کہا کہ وہ چاہتا ہے کہ میں اس کا گناہ ہنسی میرے لئے یہ سب بڑا برکت
مگر مجھے معلوم نہ تھا کہ یہاں کیا دینا چاہتے۔ ریمیں کے قول کے مطابق یہ بیاہ دینا کافی تھا
کہ لڑائی نے اسے دھوکا دیا ہے۔ میں نے اس کا گناہ ہنسا قبول کر لیا۔

ہم ہار گئے اور ریمیں نے ایک قہرہ خانہ میں مجھے براہی بیڑی کی۔ پھر ہم نے
بیڑی کی ایک بازی کھیلی۔ مگر مجھے مشت نہیں امد میں ڈر گیا۔ پھر وہ ایک چٹکے کا جانا چاہا
تھا مگر میں نے انکار کر دیا اور کہا کہ مجھے یہ پسند نہیں۔ ہم آہستہ آہستہ لوٹے اور اسی
نے مجھ سے کہا کہ وہ کسی قدر خوش ہے کہ وہ اپنی داشتہ کو مزا دینے میں کامیاب ہو گیا ہے
میرے ساتھ وہ بہت پیار محبت کر رہا تھا۔ میں نے سوچا کہ یہ وقت اجازت لیجئے
کہ کتنے نما سب ہے۔

دور سے میں نے بڑے سے مکان کو بندر گاہ کی سیڑیوں پر دیکھا۔ وہ بہت گھرا ہوا
برا معلوم ہوتا تھا۔ جب ہم قریب پہنچے تو میں نے غور کیا کہ کتنی اس کے عمارت نہیں تھا
وہ ہر طرف مڑ مڑ کر دیکھ رہا تھا۔ گئی کے گھٹ پر میرے کیڑے پہنچنے کی کوشش کر رہا تھا
وہ جڑا رہا تھا اور اس کے اندھنوں میں کوئی ربط نہ تھا۔ اُس نے سرک پر اپنی چوٹی چھوٹی
شریف آنکھوں سے پھرتا ہوا شروٹ کر دی۔ جب ریمیں نے اُس سے پوچھا کہ کیا بات ہے
تو اُس نے کوئی جواب نہ دیا۔ میں نے مبہم طور پر کہا کہ وہ جڑا رہا ہے۔

”جانی — سو را“

اور اس کی گھبراہٹ بدستور جاری رہی۔ میں نے اُس سے پوچھا کہ اس کا کتنا کہاں
ہے۔ اُس نے جلدی میں جواب دیا
”وہ کہاں گیا ہے۔ پھر منتا اُس نے بندہ آواز سے کہا کہ میں صبر صبر کرتے

کھینک کر طرف چلنے لے جا رہا تھا۔ میڈم مسلمان کی بیڑیوں کے اور گرد بہت
لوگ جمع تھے۔ میں دم بھر کے لئے ایک دکان دیکھنے لے کر ایک آدمی میں نکلا تو وہ
وہاں نہیں تھا۔ بہت غصہ سے میں سڑج رہا تھا کہ اسے ایک پڑ خرید دوں جو بڑا کم قیمت
ہو مگر مجھے کبھی یہ خیال نہیں آیا کہ یہ رنگ حرام اس طرح چاہے گا۔

پھر ریمیں نے آئے سمجھا کر کتنے گم ہو جی ہاتے ہیں اور پھر روٹ آتے ہیں اُس
نے اُسے انکسٹن کی شاخیں دیں جو اپنے ماک کو دھونڈنے کی خاطر میڈم مسافرت
لے کر گئے آتے ہیں۔ مگر ان سب باتوں کے باوجود وہ صاحب پریشانی معلوم ہوتا تھا۔

”وہ اسے جان سے مار ڈالیں گے تم سمجھو؟ میرا صاحب ہے پوچھیں واسے۔
میں نہیں سمجھتا کہ کوئی اسے گھر لے جائے گا اور اس کی دیکھ بھال کرے گا۔ یہ ہر نہیں
سکتا کیونکہ اس کے زخموں کے کھرٹے سب لوگوں کو گھن آتی ہے۔ سچی ہی اس کو
مار ڈالیں گے۔ چینی بات ہے۔“

پھر میں نے اُس سے کہا:

”اُسے تھا نے میں جان چاہتے۔ وہاں ایک کاجی باؤس ہے جہاں آوارہ کتوں
کو رکھا جاتا ہے۔ وہاں واجب لا وارتم جمع کرنی چاہئے اور گناہ واپس لی جائے گا۔
اُس نے مجھ سے پوچھا:

”وہ کتنی ادا کرنا پڑتی ہے؟“

مجھے معلوم نہ تھا۔ اُسے پھر غصہ آگیا:

”ایسے ملک حرام کے لئے مال خرچ کرنا، اسے موت ہی آ جائے تو اچھا ہے؟
اور اُس نے گولیاں مینا شروع کر دیں۔ ریمیں ہنسنا اور محارت میں لگی گئی۔ میں اُس

کے پیچھے جو ہوا ان ہم دونوں اپنے مکان کی منزل کو چلے گئے۔ ایک سو بعد میں نے بڑے
مناظرے کے درمیان کی آہستہ گئی۔ اُس نے میرے دروازے پر دھک دی۔ جب میں نے
دروازہ کھولا تو اندر مردہ چرکھٹ پر لگا اور دیکھ کر کہہ:
"صاف کیجئے۔ صاف کیجئے!"

میں نے اُسے اندر آنے کی دعوت دی مگر وہ نہیں چاہتا تھا کہ داخل ہو۔ وہ
اپنے جوتوں کی دھک اور اپنے کانچے ہوئے کھڑکڑالے لٹکے دیکھتا رہا۔ میری طرف
دیکھ کر بغیر کسی منہ بھر کے کہا:

"سو سو برس دو سو سو سال پہلے مجھے اُسی سے کہا تو نہیں کہ دیں گے: وہ مردہ نہیں
آئیں گے ورنہ میں اسی کے بغیر کہاں جاؤں گا!"

میں نے اُس سے کہا کہ تمہارے والے گم شدہ کتوں کو تین دن حفاظت میں رکھتے
ہیں اور اس مدت میں دھک انہیں دہیں سے جا سکتے ہیں اور اب اُسے اختیار ہے جو
مناصب سمجھے کرے۔ کچھ دیر وہ خاموشی سے میری طرف دیکھتا رہا۔ پھر اُس نے بڑے
کہا: "شب بخیر!" اُس نے اپنا دروازہ بند کر لیا۔ مجھے سنائی دیا کہ وہ کمرے میں بے کُن
سے ابھر کر نکلا رہا ہے۔ اس کا ہنگامہ ترقی رہا ہے اور ایک عجیب جلی آواز اُس کے
پتنگ کمرے سے آ رہی ہے۔ میں نے سمجھا کہ وہ دروازے سے معلوم نہیں کیوں مجھے اتنی
کا خیال آ گیا۔ اگلی صبح مجھے جلدی اٹھنا پڑی۔ مجھے لہجہ نہ ملتی اور میں کھانا کھا کر
بغیر سو گیا۔



میں نے مجھے دفتر میں بھیجا کیا۔ اُس نے مجھ سے کہا کہ اس کے ایک دوست
نے جس سے اُس نے میرا ذکر کیا تھا، مجھے دعوت دی ہے کہ آوارہ گاہی کے
باہر اس کے جنگلی گناہیں جو سنہرے کنارے پر ہے۔ میں نے جواب دیا کہ میں
ایسا کرنا تو چاہوں گا مگر میں پہلے ہی ایک لڑکی کے ساتھ دن گزارنے کا وعدہ کر چکا
ہوں۔ درمیان میں فرما کہ وہ اسے بھی دعوت دیتا ہے۔ اُس کے دوست کی بہن
بہت خوش ہو گئی کہ وہ مردوں کے انجمن میں اکیلے دعوت نہیں ہے۔

میں چاہتا تھا کہ ذرا ٹیلیفون بند کر دوں کیونکہ مجھے معلوم تھا کہ ہزار افسر سپہ
نہیں کہہ کر ہم خبریں ذاتی ٹیلیفون کیا کریں۔ مگر مردوں نے اتفاقاً کیا کہ ذرا ختم ہوا اور
کہا کہ وہ شام کو مجھے دعوت دے پہنچا سکتے ہیں۔ لیکن اب وہ چاہتا تھا کہ اپنے متعلق
مجھ سے بات نہایت کرے۔

"صاف کیجئے۔ صاف کیجئے!" اُس نے کہا۔ اُس کی ایک ٹولی سارا دن میرے پیچھے کرتی
رہی ہے۔

اس کے قول کے مطابق وہ اُس کی پانی داشتہ کے بھائی کی عیال میں تھے۔

”اگر شام کو لوٹتے ہوئے تم انہیں عمارت کے قریب دیکھو تو مجھے اطلاع دینا۔ میں نے کہا ہوتے ہیں۔“

غصہ بڑی دیر بعد افسر نے مجھے بلوایا۔ اسی وقت مجھے اٹھیں سی ہوئی کیونکہ میں نے سوچا کہ وہ عمارت کھنڈے والا ہے کہ علیحدگی کم کیا کر دو کام زیادہ۔ مگر یوں نہ تھا۔ اُس نے مجھے کہا کہ وہ ایک سکیم کے متعلق جرائد کھیل نہیں ہوتی ہے مجھ سے بات چیت کرنے والا ہے اور اس معاملہ میں وہ صرف میری رائے دریافت کرنا چاہتا ہے۔ اسی کا ارادہ تھا کہ دفتر کی ایک شاخ میں میری کھولے جو دن کا کام دینی نیشا یا کرے اور باہر راست بڑی فرسوں کے ساتھ رابطہ قائم کرے۔ وہ معلوم کرنا چاہتا تھا کہ کیا مجھے وہاں جانے میں دلچسپی ہے۔ اسی صحت مجھے پیر کی میں رہنے کا موقع مل جائے گا اور سال کے ایک حصے میں سفر بھی کر سکوں گا۔

”تم جہاں ہو اور مجھے یقین ہے کہ یہ زندگی تمہیں پسند آئے گی۔“

میں نے کہا کہ اُن مگر درحقیقت مجھے کچھ فرق نہیں پڑتا۔ اُس نے پھر غصے پوچھا کہ کیا میں زندگی میں کوئی تغیر نہیں پسند کرتا؟ میں نے جواب دیا کہ انسان دراصل کبھی زندگی نہیں بدلتا۔ بہر حال ہر چیز کا اپنا اپنا مقام ہے اور مجھے اپنی زندگی کبھی ایسی پسند بھی نہیں۔ وہ عرض معلوم نہیں ہوتا تھا مجھے کہا کہ میں ہر وقت گھبراہٹ کرتا ہوں اور مجھ میں کوئی اطمینان نہیں اور دوبارہ کے لئے یہ رویہ نہایت ہے۔ میں پھر کام پر واپس چلا گیا۔ بہتر ہوتا کہ میں اسے نالاغی نہ کرتا۔ لیکن مجھے اپنی زندگی بدلنے کی کوئی وجہ نظر نہیں آتی تھی۔ میں نے اس پر بہت غور کیا۔ یہی غصہ تھا جب میں طالب علم تھا۔ میں نے اس قسم کی بہت خواہشات تھیں۔ مگر جب میں نے چرماقی

چھوڑی تو میں نے بہت جلد پایا کہ دراصل یہ سب خیر اسم اور بے کار باتیں ہیں۔ شام کو غریب میری تلاش میں آئی اور مجھ سے پوچھا کہ کیا میں اس سے شادی کرنا چاہتا ہوں؟ میں نے کہا کہ مجھے تو کوئی فرق نہیں پڑتا اور اگر وہ چاہتا ہے تو میں یوں ہی کرکتے ہیں۔ پھر وہ معلوم کرنا چاہتی تھی کہ مجھے اُس سے عشق ہے۔ میں نے جواب دیا کہ جیسا کہ میں ایک مرتبہ پہلے بھی کہہ چکا ہوں یہ بات بے معنی ہے اور بے شک مجھے اُس سے محبت نہیں ہے۔

”پھر کون مجھ سے شادی کرتے ہو؟“ اُس نے کہا۔

میں نے اسے سمجھایا کہ اسی کی تو ہرگز کوئی اہمیت نہیں اور اگر اس کی یہ خواہش ہے تو ہر شادی کرکتے ہیں۔ بہر حال تقاضا تو وہ کر رہی تھی اور میں نے صرف اُن کو حق اس نے پھر کہا:

”شادی نہایت سنجیدہ معاملہ ہے۔“

میں نے جواب دیا۔ ”شبیہ“

وہ ایک ٹھکے لے حاکم برہمنی اور خاموشی سے مجھے دیکھتا رہی۔ پھر اُس نے بات کی۔ وہ مجھ سے محض یہ چاہتا تھا کہ اُن کی نظر میں کوئی اور صورت ایسی ہی تجویز چھین کرے تو کیا میں اسے قبول کروں گا اور کیا میں اس کو بھی اسی طرح یاد کروں گا۔ میں نے کہا: ”جیسا؟“ اُس نے پھر کہا کہ وہ مجھ سے محبت کرتی ہے اور مجھے اُس کا ہیکل اُٹھایا اور علم نہیں ہے۔ خاموشی کے ایک اور لمحہ بعد بڑ بڑائی کہ میں حسیب بہادر آدمی ہوں مگر بے شک یہی وجہ تھی کہ اُسے مجھ سے محبت ہے جس کے خیال میں وہ ہے ایک دن اُسے مجھ سے نفرت ہو جائے گی۔ چنانچہ میں خاموش رہا اور کچھ نہ کہا۔ وہ مسکراتی ہوئی مجھ سے

لو کہ اُس نے مجھے تیار کر اُس کا کٹا گم ہر گیا ہے کیونکہ وہ کاغذی ڈاکس میں نہیں ہے۔
 دہلی کے کارندوں نے اُس سے کہا تھا کہ شاید وہ کسی موٹر سائیکل پر آگیا ہے۔ اُس نے مجھ سے
 پوچھا کہ کیا یہ ممکن ہے کہ تھانے سے معلوم کیا جاسے۔ میں نے جواب دیا کہ کوئی ایسی
 چیز اُس کا وہاں حساب تو رکھتا نہیں کیونکہ ہر روز ایسے واقعات ہوتے ہی جتے ہیں۔ یہی
 تھے بڑے سمارٹ سے کہا کہ وہ ایک اور کتا کیوں نہیں پالی جیتا۔ مگر اُس نے ٹھیک کہا کہ
 وہ اس سے مانوی جو چکا تھا۔

میں اپنے بستر پر دوڑا ہر گیا اور سٹاف میز کے سامنے ایک کرسی پر میرے مقابل
 بیٹھ گیا۔ اُس کے دونوں ہاتھ گتھنوں پر تھے۔ وہ اپنی پرانی ٹوٹی پینے رٹا۔ وہ اپنی چابی
 موٹھوں سے بھولی کے آخری حصے چارہ لٹا۔ وہ مجھے پور تو کر داتا تھا مگر مجھے کچھ کا
 نہیں تھا اور سبب یہ بھی نہیں آ رہی تھی۔ کچھ کہنے کی خاطر میں نے اُس کے کتے کا ذکر چھوڑ
 اُس نے مجھ سے کہا کہ اپنی بیوی کی موت کے بعد اُس نے کتا پالا تھا۔ اُس نے غصہ سے
 سے شادی کی تھی۔ جوانی میں اُسے تھیرا کا شرط تھا۔ اپنی جوتے کے تھیرا میں اچھا خاصا
 پارٹ ادا کیا کرتا تھا مگر بعد میں اُس نے ریل سے کی ملازمت اختیار کر لی اور اس پر
 اسے کچھ انصاف نہیں تھا کیونکہ اب اس کے پاس سر چھپانے کو ایک چھوٹا سا ٹھکانہ تھا
 وہ اپنی بیوی کے ساتھ خوش نہیں تھا کیونکہ مجموعی طور پر وہ اس سے خاصا مانوس ہر گیا
 تھا۔ جب وہ رات کو اُسے تنہا کی بہت احماسی ہر گیا۔ اُس نے اپنے ایک ساتھی
 سے جی کی کتابا نے پتہ دے دئے تھے ایک بچہ مانگا۔ اس وقت وہ بہت چھوٹا تھا اور اُسے
 بڑی سے ڈر دھڑکا رہا تھا۔ چونکہ کتے کی عمر انسان سے کم ہوتی ہے۔ اس نے وہ
 دونوں ایک ہی ساتھ بڑھاپے کو پہنچے۔

”وہ بڑا اخلاقی تھا۔ سارا نوٹس کیا۔ داتا تو اتنی ہندی دھاتی بھی ہوتی تھی مگر شتا
 وہ بہر حال ایک اچھا کتا۔“

میں نے کہا

”وہ اچھی نسل کا تھا۔“

اور سٹاف بہت خوش نظر آیا اور پھر اُس نے مزید کہا:

”تم اُس کی بھاری سے پیچھے پہچان بھی نہ کیتے۔ اس کے بال بہت خوبصورت تھے۔
 جلد کی چھاری کے بعد سٹاف پر روز صبح شام اُسے ہم لگو یا کرتے تھا کیوں اس کے
 قاتل کے مطابق اس کا اسی مرض تو رہا پتا تھا اور بڑھاپے کا کوئی علاج نہیں۔“

اس وقت میں نے جھاتی کی اور پھر مجھے نے اعلان کیا کہ وہ رخصت ہوا چاہتا
 ہے۔ میں نے اُس سے کہا کہ وہ نظر نہ کرنا ہے اور یہ بھی کہا کہ میں کتے کے حادثہ کی وجہ سے
 بہت پریشان ہوں۔ اُس نے میرا شکریہ ادا کیا۔ اُس نے مجھ سے کہا کہ اُتی کو اُس کا کتا بہت
 پسند تھا۔ اُتی کی بات کرتے ہوئے وہ اُتی کو آپ کی بے چاری والدہ محترمہ تھا اُس
 نے فرم کر دیا تھا کہ اُتی کی موت کے بعد مجھے بہت تنگی ہونا پڑے۔ میں نے کوئی تہ
 نہ دیا۔ پھر اُس نے مجھ سے کہا بہت بڑھاپا ہٹ اور غصے کے اشارہ میں کہ اُسے معلوم ہے
 کہ مجھے کے لوگ مجھے سمجھنے میں غلط فہمی میں مبتلا ہیں کیونکہ میں نے اُتی کو بڑھاپا کے
 غیر انی مستی میں داخل کر دیا تھا۔ لیکن وہ بے شک مجھے پہچانتا ہے اور خوب
 سمجھتا ہے کہ مجھے اُتی سے بہت پیار تھا۔

میں نے اُسے جواب دیا

”مجھے تو ایک معلوم نہ تھا کہ اس معاملہ میں لوگ مجھے برا سمجھتے ہیں۔ لیکن

بڑھوں کا ہسپتال مجھے ایک فطری تقاضا معلوم ہوتا تھا کیونکہ میرے پاس اتنی کی دیکھ بھال کے لئے کافی سرمایہ نہ تھا۔ بہر حال میں نے کہا: "انہوں نے بہت عرصے سے مجھ سے کوئی بات نہیں کی اور اندر ہی اندر ایسی جھگڑا رہی ہے۔"

اگرچہ اس نے کہا: "بڑھوں کے ہسپتال میں کم از کم ساتھی تو مل جاتے ہیں۔" پھر اس نے اجازت چاہی۔ وہ سونا چاہتا تھا۔ ان کی زندگی بھلی تھی اور اس کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ اب کیا کرے۔ بسب سے میرے جانتا ہوں پہلی مرتبہ اس نے کسی میلے سے اپنا ہاتھ میرے ہاتھوں سے دے دیا اور مجھے اس کی جگہ کے کھڑے ٹھوس کر دے۔ وہ آزاد مسکرایا اور جانے سے پہلے کہا:

"مجھے امید ہے کہ کتنے آج کی رات نہیں بھولیں گے۔ یہ ہمیشہ یہ سوچتے گئے ہوں کہ یہ میرا ہی گناہ ہے۔"

۶

اسی وقت کی صبح کو میں بڑی مشکل سے جاگ۔ داری کو کھٹے جا کر نیچے جھانکنا۔ ہم نے کچھ ناشتہ کیا کیونکہ ہم چاہتے تھے کہ سویرے سویرے سمندر میں نہانے چلے جائیں۔ میں بالکل ٹھنڈی، اندر میں تھا اور میرے سر پر ہلکا سا درود ہوا تھا۔ بسو کے پہلے سگریٹ کا مذاق تھا۔ داری میں لذائق اڑا رہی تھی کیونکہ میں نے کہا کہ میں شازہ میں شامل ہونے والوں کی طرح سرگرد نظر آؤں۔ میرا حال واقعی بچا تھا۔ اس نے سفید توپ کا ایک مصلیٰ ڈھالا ہوا زیب تن کیا اور اپنے بال کھٹے چھڑو دیئے۔ میں نے اس سے کہا کہ وہ خوبصورت لگ رہی ہے۔ یہ لڑکی کہ وہ خوشی کے مارے خوب سنہی۔

نیچے اترتے ہوئے میں نے ریموں کے دروازے پر دستک دی۔ اس نے میری جانب دیا کہ وہ پل بھر میں نیچے آہی رہا ہے۔ وہ منہ صاف چہرہ چھپاتا تھا۔ تھکاہٹ کی وجہ سے اور شاید اس نے بھی کہہ نہ سکا کہ میں نے دن بھر کھڑکی نہیں کھولی تھی۔ شہر پر اتنے ہی سورج کی روشنی مجھے طمانچہ کی طرح لگی۔ مگر ماری خوشی کے مارے چہرہ ہی سنی اور مسلسل کبڑی تھی:

"موسم اچھا بہت خوشی گوار ہے۔"

میری طبیعت کچھ سنبھلی تو میں نے محسوس کیا کہ مجھے ہلچل لگی ہے۔ میں نے غصہ کو تھپاتا تو اُن کے منہ سے اچھا کیوں کہ تمہیں دکھا دیا جس میں ہمارے تیرنے کے ادھار اور ایک دھار پر تو یہ لپکا ہوا تھا۔ اب انتظار کے سوا اور چارہ ہی کیا تھا۔ ہم نے ریڑھ کو اپنا دھارہ بند کرتے ہوئے سنا۔ وہ ٹپ ٹپ کی آہیں والی سفید قمیض پہنے ہوئے تھا جس کی ہر پٹھوں کی ایک کشتی نما قوطی تھی جسے دیکھ کر ادنیٰ کو ہنسی آگئی۔ اُن کے بازو اپنے کمرے باؤں سے بہت مفریق معلوم ہو رہے تھے۔ مجھے اسی کو ہاس ڈراما نہ بھلایا۔ دو نیچے اترتے ہوئے سینے پر لپکا اور بہت طعنیہ نظر آتا تھا۔ اُن کے منہ سے یہ کہتا:

"سلام ہوئے میاں!"

اور ادنیٰ کو اُن کے منہ سے محسوس ہو کر کہ خطاب کیا۔

اگر شام ہم تھا نہ گئے تھے۔ میں نے شہادت دی تھی کہ لڑکی نے۔ میں کو دھوکا دیا تھا۔ اور پائیس نے اسے صرف ذہنی تندر کے کچھ چھوڑ دیا تھا۔ میرے بیان کی کوئی تصدیق نہیں کر سکتا تھا۔ دروازے کے سامنے کھڑے ہم اس معاملہ پر ریوں سے باتیں کرتے رہے۔ پھر ہم نے فیصلہ کیا کہ ہم کچڑیں۔ سندھو اگرچہ زیادہ دور نہیں تھا مگر ہم نے سوچا کہ یوں ہم ذرا جلدی پہنچ جائیں گے۔ ریوں کو ہمیں تھا کہ اس کا دوست یہ دیکھ کر کہ ہم وقت سے پہلے پہنچے ہیں بہت خوش ہو گا۔ ہم پہنچے ہی واسے تھے کہ معاملہ میں نے مجھے اشارہ کیا کہ اپنے مقدمہ کی جگہ وہاں۔

میں نے ریوں کی ایک ٹوٹی دیکھی۔ وہ تھوڑی کی دکان کے سامنے ٹیک لگائے ہوئے تھے۔ وہ ہمیں غرضی سے دیکھ رہے تھے۔ ان کے انداز سے معلوم ہوا تھا

کہ وہ ہمیں ہتھکڑیاں پہنا دینا چاہتے تھے۔ ہم نے ذمہ نہ لیا۔ ریوں نے مجھ سے کہا کہ بائیں جانب سے دھرا شعلہ اس کو تقدی دیکھی ہے۔ وہ کھولیا کھولیا معلوم ہوتا تھا۔ اُن کے منہ سے یہ کہتا تھا کہ ہر حال میں اب اس کا حلیہ ختم ہو چکا ہے۔ ادنیٰ کو کچھ شکیک سمجھ نہ آئی اور اُن کے منہ سے یہ کہتا تھا:

"معاذ کیا ہے؟"

میں نے اسے بتایا:

"وہ عرب ریوں کی تاک میں ہیں۔"

اُن کے منہ سے یہ کہتا تھا کہ ہم فوراً دوڑیں۔ ریوں نے طنزاً اسے دھوکا دیا کہ اُن نے ہنسنے ہوئے کہا:

"تواری ہے کہ ہم چل دیں۔ وہاں رکھنے کا کوئی مطلب نہیں۔"

ہم ہمیں اشاپ کی طرف برقعوں سے سے فاصلہ پر تھا چل دیے اور ریوں نے مجھے بتایا کہ اب عرب ہمارا قاتل نہیں کر رہے۔ میں نے بھی مڑ کر دیکھا۔ وہ ابھی تک وہیں تھے اور اسے لا پرواہی سے اسی جگہ کی طرف دیکھ رہے تھے جو ہم چھوڑ کر آئے تھے۔ ہم یوں پر سوار ہو گئے۔ ریوں بہت طعنیہ نظر آتا تھا۔ وہ ادنیٰ سے تمام وقت مذاق کرتا رہا۔ میں نے محسوس کیا کہ وہ ادنیٰ کو کبھی مکتی ہے۔ مگر اُن کے جواب میں ریوں کو تعجب ہوا کہ وہ صرف دُعا کرتا تھا۔ مجھے مسکرا کر دیکھ رہی تھی۔

ہم اب لیر کے قواف میں آ رہے۔ ساحل میں اشاپ سے دور نہ تھا۔ مگر ایک چرٹے سے میڈی مرقع سے جو سندھ کے مغرب پر تھا ہوا تھا گزرا پڑا تھا۔ اس کو رنگ لپکا تھا اور اُن کے تھیلے مرقع پہنے پھروں اور سفید پردوں سے ڈھکی ہوئی تھیں۔ اسی

کی جو سمون سمندر کے کنارے کی طرف تھی۔ ماری اپنے دو ہار یاد تویر کے حیلے سے
پلوں کے ساتھ اٹھکسیدیاں کر رہی تھی اور ان کی بیڑوں کو گرا کر نوش ہو رہی تھی۔ ہم
چمڑے چھوٹے ٹنگوں کی دور در دور نگار کے درمیان چل رہے تھے۔ ان کے بازو ہر
اور منہ زنگ کے تھے۔ اسی میں سے کچھ اپنے بڑا ہونے کے ساتھ تارک کے درخت
کے نیچے دھسے ہوئے تھے اور کچھ پتھروں کے درمیان مقنق تھے۔

میرا یہ سرفعلیہ پانچپنے سے پہلے ساکت سمندر صاف دکھائی دیتا تھا اور دور
دور ایک خوابیدہ سی بڑی چٹان شفاف پانی میں کھڑی نظر آتی تھی۔ اس پر سکون غلامیں
میں کرکڑ کا ایک ہلکا سا شور مچا رہا اور ہم نے بہت دور ایک ناہی گیر گشتی دیکھی، جو
پچھلے برس سمندر میں آہستہ آہستہ ہماری طرف بڑھ رہی تھی۔ ماری نے چٹان کے پتھروں
سے توی قرح بنائی۔ ہم نے دیکھا کہ نہانے والے اڑھتوں پر جو سمندر کی طرف تھی وہ
پہلے سے ہی موجود ہیں۔

روبروں کا دوست ساحل کے اس کنارے پر کھڑی کے ایک ہنگامی رہتا تھا۔
مغرب پار یہ مکان چٹان کی ٹیگ سے رٹا تھا اور سامنے کھڑی کے ستروں کے سہارے
کھڑا تھا۔ یہاں سمندر کی پانی پہنچ چکا تھا۔ روبروں نے ہمارا تعارف کرایا۔ اس کے دست
کا نام میس (mess) تھا۔ وہ غذا دار قسم کا آؤ تھا۔ لذت مست اور ہوا ہم اور
کنہ سے چڑھے پچھلے۔ اس کے ساتھ ایک چھوٹی سی خوش منقوش خاتون تھی جس کا ب
نہج پرانے کے لوگوں کی طرح تھا۔ اُس نے ایک دم ہمیں خوش آمدید کہا اور بتایا کہ کھانے
کوئی برقی چھوٹی جالی میں بیٹھی کھڑی تھی تیار ہے۔ میں نے اسے کہا کہ اس کا گھر بہت
نور خوبصورت ہے۔ میس (mess) نے مجھے بتایا کہ وہ مفتہ افراد اور باقی سب سبیلان

دو چکر لڑاتے ہیں۔ اُس نے مزید کہا کہ میرا بیوی کے ساتھ میاں وقت خوب گزرتا ہے
اس کی بیوی ماری کے ساتھ ہنسی رہی۔ میں نے شاید پہلی مرتبہ دیکھ لیا کہ کبھی
سے شادی کرنے والا ہوں۔

میس فوراً سمندر میں نہانا چاہتا تھا مگر اس کی بیوی اور روبروں ابھی نہیں جانا
چاہتے تھے۔ چنانچہ ہم تینوں نیچے اترے اور ماری فوراً پانی میں کود پڑی۔ بیس اور
میں نے فوراً انتظار کیا۔ وہ آہستہ آہستہ بات کرتا تھا۔ میں نے دیکھا کہ اُسے ہر لحاظ کو
اس جہر پر ختم کرنے کی عادت تھی "اور میں یہ بھی کہوں گا" مگر وہ اور کوئی بات نہ کر رہی
تھی فقرے کے معنوں میں کوئی اضافہ نہ ہو۔ ماری کے متعلق اُس نے مجھے کہا:

"وہ دلچسپ ہے اور میں یہ بھی کہوں گا کہ وہ خوبصورت ہے۔"

پھر میں نے اس کے مکمل کلام کی طرف کچھ توجہ نہ دی کیونکہ میں دلچسپ دیکھنے پر آمادہ
تھا اور اس میں مجھے حلف آ رہا تھا۔ پانچ سے ریت گرم ہونا شروع ہو گئی۔ میں نے چٹان
میں گھسنے کی خواہش کو دبا دیا۔ مگر آخر کار میں نے میس سے کہا:

"چلو گے؟"

میں پانی میں کود پڑا۔ وہ آہستہ آہستہ پانی میں داخل ہوا اور جب کھڑی میں اس
کے پاؤں پھسل گئے تو وہ مجھ پر تیرنے لگا۔ وہ دونوں سے تیز تھا اور ناخدا آہستہ۔ میں نے
اسے پیچھے چھوڑ دیا اور میں ماری کے پاس پہنچ گیا۔ ہم دونوں کا منہ تھا کہ ہم ایک
ساتھ خوب تیر رہے ہیں اور بڑے سر سے ہیں۔

آخر کار ہم پیر کی کھٹکتے پر چڑھ گئے۔ ہم کھڑکی کی بیٹھ جڑے تھے میرا منہ
آسمان کی طرف تھا۔ پانی کی آخری بوندیں جو میرے منہ میں پک رہی تھیں، دلچسپ ہیں

سو کھٹے لگیں۔ ہم نے دیکھا کہ مہین بھی دھوپ بیکھنے کے لئے سمندر کے کنارے ٹوٹ آیا ہے۔ ٹور سے وہ دیکھ لگی کی طرح بہت بھاری غیر کم معلوم ہوتا تھا۔ ماری چاچی لٹو کہ ہم اکٹھے تریں۔ میں اس کی پیچھے چل پڑی۔ میں نے اس کی کڑکڑاچی تھی اور وہ بڑوں کے بل تیر رہی تھی اور میں اس کو پاؤں ڈالنے میں مدد دے رہا تھا۔ سیسہ دم پانی کا جگا ہلکا شہر ہزار تعاقب کر رہا تھا۔ میں نے صبر کیا کہ میں تھک گیا ہوں۔ پھر میں نے ماری کو چھوڑ دیا اور سیدھا تیرنا ہوا لوٹ آیا۔ اب میرا سامن ٹھیک آ رہا تھا۔ میں نے پانی کنارے پر اس کا پیٹ کے بل بیٹ لگایا اور سڑیت پر رکھ دیا۔ میں نے اس سے کہا:

”اس میں بڑا مزہ ہے۔“

اس کی جھجکی اسے تھی۔ کچھ دیر بعد ماری ٹوٹ آئی۔ میں ٹوٹا کہ اسے قریب آتا ہوا دیکھوں۔ وہ لگے پانی سے اٹھتی ہوئی تھی اور اس نے اپنے بال پیچھے کئے ہوئے تھے۔ وہ میرے پہلو میں لیٹ گئی۔ سورج اور اس کے جسم کی فی جلی کر رہی سے بھر پور لگی۔ میری فز وگی طاری ہو گئی۔

تھوڑی دیر بعد ماری نے میرا شاؤ ڈال دیا اور کہا کہ میں اپنے یہاں چھا گیا ہے۔ شاید کھانے کا وقت ہو گیا ہے۔ میں فوراً اٹھ کھڑا ہوا کیونکہ مجھے بھوک بہت لگ رہی تھی۔ لیکن ماری نے مجھے کہا کہ صبح سے میں نے ایک بار بھی اس کو بوسہ نہیں دیا یہ بات ٹھیک تھی۔ اگرچہ میرا جی کٹی بار چاہا۔

”پانی میں آؤ!“ میں نے اس سے کہا۔

ہم بھاگے تاکہ چھوٹی جھروں میں لیٹ سکیں۔ ہم نے کچھ دیر انتظار کیا اور

وہ میرے ساتھ چوٹ لگی۔ اس کی ناگہمیں میری ہانگوں کے گرد تھیں اور مجھے اس پر پیار لگ گیا۔ ہم لوٹے تو مہین اپنے گلے کی ٹیڑھیوں پر کھڑا ہوا میں پہلے ہی آواز سے رہا تھا۔ میں نے کہا:

”مجھے شہادت کی ٹیڑھی لگی ہوئی ہے۔“

اس نے فوراً چاچی بڑی کو کہا کہ میں اسے بہت اچھا لگتا ہوں۔ کھانا ذیذیقا۔ جو اپنے قصہ کی پھل لگی گیا۔ گوشت اور تلے ہوئے آٹا بھی باقی تھے۔ ہم سب خاموشی سے کھا رہے تھے۔ مہین مختصر قریب قیاد اور مجھے بھی مسلسل دینا رہا۔ جب کافی کی قربت آئی تو میرا سر دبا بھاڑی جا رہا تھا۔ میں نے بکے بعد کچھ شکریت مینا شروع کر دیے۔ مہین اب میں اور میں۔ ہم نے فیصلہ کیا کہ اگست کا مہینہ سمندر کے کنارے ایک ساتھ گزار دیں گے۔ ماری نے ہمیں اچھا کہا:

”تھوڑے عرصہ سے کیا وقت ہو گیا ہے۔ صرف سارے گیارہ بج چکے ہیں۔“

ہم سب میری ہونے لگی مہین نے کہا:

”کھانا ذرا جلدی ہو گیا ہے اور دراصل کھانے کا کافی وقت تو مہین نہیں چب بھر لگے کھانے کا وقت ہے۔“

مجھے معلوم نہیں کہ اس ماری کو کیوں مہین لگتی۔ میرا خیال ہے کہ وہ شراب دانہ دارہ پانی لگی تھی۔ مہین نے پھر مجھ سے پوچھا:

”کیا تم سمندر کے کنارے میرے ساتھ ٹھہرنے چاہو گے۔ میری بڑی کھانے کے بعد جیٹہ تھوڑا کرتی ہے۔ مگر مجھے یہ پسند نہیں۔ مجھے ڈا پیو لی کرنا چاہئے۔ میں ہمیشہ اُس کے کتبہ ہوں کہ صحت کے لئے یہ بہت بہتر ہے مگر آفراسے اپنی رائے رکھنے کو کہتا

ہے :

اوری نے اعلان کیا کہ وہ ہادام میسن کے ساتھ رہے گا تاکہ برقی دھونے میں اُس کی مدد کر سکے۔ شخصی کامیابی کی خاطر نے کہا :
"مزدوری ہے مردوں کو باہر نکالنا جانتے۔"

چنانچہ تمام تینوں بیٹھے اتر سکے۔ سردیوں پر آہستہ آہستہ دوسرے ریت پریر گیا۔ پڑھ رہی تھی۔ ساحل پر اب کوئی آدمی نہیں تھا۔ سمندر کے کنارے چھری کاغذ اور ترسوں کی کئی کئی آوازیں آ رہی تھیں۔ چٹانوں سے دوسرے کی دوسرے ٹھٹھکیں نکلی رہتی تھیں اور سانس لینا مشکل ہو رہا تھا۔ شروعات شروع میں ریویں اور میسن ایسی چیزوں اور ایسے لوگوں کے متعلق باتیں کرتے رہے جی سے میں ناواقف تھا۔ مجھے سمجھ آئی کہ وہ ایک دوسرے کو رحم سے جانتے ہیں اور زندگی کا ایک حصہ اکٹھے گزار چکے ہیں۔ ہم اپنی ہی طرف جا رہے تھے اور سمندر کے کنارے کنارے چل رہے تھے۔ کبھی کبھار ایک چھوٹی سی ہر جواروں کی صفوں سے فراہمی تہ ہوتی ہمارے کینٹین کے جوتے تکر جاتی۔ میں کچھ بھی نہیں ملاحظہ رہا تھا۔ میرے شک سے سر پر جو دھوپ پڑ رہی تھی۔ اس کی وجہ سے میں تقریباً سویا ہوا تھا۔ میں اس وقت دیرین نے میسن سے کچھ کہا جس میں ٹھیک طور پر نہ لگا۔ بہر حال میں اتنا سمجھ گیا کہ ساحل کا آخری حصہ ابھی بہت دور ہے۔ دوسرے جیسے تواریف کے ہم ہوتی طرف آ رہے تھے۔ میں نے دیرین کی طرف دیکھا اور اُس نے کہا :

"کیا وہی ہے؟"

ہم چلتے گئے۔ میسن نے چوہا کہ وہ کیونکر وہاں تک ہمارے پیچھے آئی دیکھنے میں نے سر ہچا کر انہوں نے ہمیں اس پر سوال کرے ہر سہ دیکھا تھا اور ہمارے اقدار

صندوق میں ٹھانے کے قریب تھے کیونکہ میں نے کچھ جواب دیا۔

عرب آہستہ آہستہ آگے بڑھتے رہے اور اب وہ ہمارے بہت قریب تھے۔ ہم نے اپنی چال بدلی لیکن دیرین نے کہا :
"اگر کوئی ہو گئی تو میسن : تم اس دوسرے سے ٹیٹ لینا۔ میں اپنے پرانے دشمن پر کوٹھڑوں کا دھم دھم کر رہا تھا۔ اگر ایک اور آدمی پہنچے تو تم اس پر چل پڑنا۔"

میں نے کہا : "جی ہاں :"

میسن نے اپنے اہل قریب میں ڈال دیے۔ تین چار ہی بیت اب مجھے آگ کی طرح معلوم ہو رہی تھی۔ ہم بار بار عربوں کی جانب جھکتے رہے۔ ہمارے درمیان ہر لمحہ خاموشی رہا تھا۔ جب ہم ایک دوسرے سے صرف چند قدم دور ہو گئے تو عرب رنگ گئے۔ میسن اور میں نے اپنی رفتار کم کر لی۔ دیرین سیدھا اپنے سریف کی جانب بھاگتا تھا۔ مجھے ٹھیک متانی تو نہ دیا مگر اُس نے اُسے کہا کہ اسے گھر عرب نے اس کے سر پر ایک سنگا رسید کیا جس کی آواز آئی۔ پھر دیرین نے پہلی مرتبہ اسے ایک تھپڑ مارا اور فوٹا میسن کو آواز دی۔ میسن اس آدمی تک جا پہنچا اور اسے دوسرے بار سے زور سے پاؤں سے تھپڑا۔ عرب اپنی من اندھ سے منگ بڑا اور چند ٹیکڈا کی طرح چار ڈاندا اس کے سر کے اور گردن کے بلبلے سطح پر آکر ٹوٹ رہے تھے۔ اس اثنا میں دیرین نے بھی دوسرے آدمی کی مار ڈالی کی اور اس کا منہ خون سے لٹ پٹ ہو گیا۔ دیرین میری طرف مڑا اور

کہا :

"تم دیکھو گے میں اس کا کیا حشر کرتا ہوں :

میں چلتا :

غیر وارث اس کے پاس نہیں ہے۔

مگر اس سے پہلے ہی یحییٰ کا بازو اور ہر زخمی ہو چکا تھا۔ میں سامنے سے
کو داگر دوسرا عرب پانی سے اٹھ کھڑا ہوا اور اپنے ساتھی کے پیچھے جرس تھا چپ
گیا۔ ہم ہنے کی جانت نہیں کر سکتے تھے۔ وہ دونوں ہماری طرف مسلسل نکلی بازو کر
دیکھتے رہے اور آہستہ آہستہ پیچھے ہٹتے رہے اور میں خبر کے عرب سے ایک نسل
پر رکھا۔ جب انہوں نے دیکھا کہ اب میں کھانا ہے تو وہ سر پٹ بھاگ نکھے۔ ہم دھڑپ
میں ساکت کھڑے رہے۔ میری کے زخمی بازو سے خون ٹپک رہا تھا اور وہ کہنی کے
اوپر اپنے بازو کو زور سے دبا کر ہوتے تھا۔

میں نے فوراً کہا:

”میں ان میں ایک ڈاکٹر ہے جو اتوار کا وہی ہمیشہ دیکھ کر رہتا ہے۔“

دو یوں فوراً اسی کے میں جانا چاہتا تھا مگر ہر تہرب وہ بات کرتا تو اس
کے زخم کے خون کی وجہ سے اس کے منہ میں جھنجھکا ہوا تھا۔ ہم نے اسے سمجھا دیا
اور جلد از جلد جھگڑ پر لٹ آئے۔ وہاں رہیں نے کہا کہ اس کے زخم گہرے نہیں ہیں
اور وہ ڈاکٹر کے بیان تنہا جاسکتا ہے۔ وہ ماموں کے ساتھ گیا اور میں مگر یہ ہی رہا
تاکہ اور توں کو سمجھا سکوں کہ کیا حادثہ پیش آیا ہے۔ مادم میں در رہی تھی اور وہی
کا رنگ بہت زرد پڑ گیا تھا۔ مجھے انہیں سمجھنے میں بہت پریشانی ہوئی۔ آخر کار میں غار
ہر گیا اور سندھ کی طرف دیکھتے دیکھتے ٹھہر گیا۔

جیڑھو مجھے کے قریب رہیں میں کے ساتھ لٹ آیا۔ اس کے بازو پر
پٹی باندھی ہوئی تھی اور اس کے منہ کے ایک کونے میں پلاسٹر لگا ہوا تھا۔ ڈاکٹر نے

میں سے کہا تھا کہ زخم معمولی ہیں۔ مگر میں بہت غور سے معلوم ہوا تھا۔ میں اُسے
ہنسائے کی کوشش کر رہا تھا مگر وہ سارا وقت خاموش رہا۔ جب اُس نے کہا کہ وہ نیچے
سندھ کے کنارے بیٹھنے جا رہے تو میں نے پوچھا کہ کیا ہمارے جو۔ وہ کچھ ہوا
خوری کے متعلق خبر فرمایا۔ میں اوروں نے اُس سے کہا کہ ہم بھی اُس کے ساتھ چلیں گے
پھر اُسے عیش آگیا اور وہ ہمیں گایاں بچنے لگا اور کہا کہ اپنے کام سے کام رکھو۔
میں نے کہا:

”اس کی مزاحمت نہیں کرنا چاہیے۔“

ہر حال جب وہ باہر نکلا تو میں اُس کے پیچھے پیچھے ہوا۔

باہر باہل توڑ کی طرح تھا۔ صوبہ چلے ہوئے آؤ۔ کی طرح ریت اور سندھ پر
گر رہی تھی۔ ہم سالہاں پر کافی بڑا کھیتے رہے۔ میرا خیال تھا کہ میں کو معلوم ہے کہ کو
کہاں جا رہا ہے مگر یہ قریب باہل غلط نکلا۔ ساحل کے آخری کنارے پر ہم ایک چھوٹی
سی ندی پر پہنچے جو ریت میں ایک بڑی سی چٹان کے پیچھے بہ رہی تھی۔ وہاں ہم نے
دونوں عرب پائے۔ وہ نیچے جڑے تھے۔ اپنے نیچے ہر کسٹر مالا دول ہیں۔ وہ باہل پر کسٹن
معلوم ہو رہے تھے اور تقریباً خاموشی۔ ہمارے آنے سے انہیں کوئی فرق نہ پڑا۔ وہ عرب
میں نے رہیں کو دیکھا تھا بغیر کچھ کہے۔ اُسے نکلی بازو کر کھڑا۔ دوسرا ایک چھوٹی سی بانٹ
جھاٹا رہا۔ میں انہوں کے ایک کونے سے دیکھتا رہا اور اپنے سارے جو حرفتیں چٹانیں
نکال سکتا تھا مسلسل بہتا رہا۔

کچھ عرصہ کوئی نہ ملا۔ اسی دوران وہاں دھوپ اور خاموشی کے علاوہ صرف چھوٹی
سی ندی اور تانوں کی آواز سنائی دے رہی تھی۔ میری رہیں نے اپنا اقدار جب میں رہا اور

پہلے دیکھا مگر عرب اپنی جگہ سے نہ اٹھا اور مسلسل اُسے دیکھتے رہے۔ میں نے دیکھا کہ بائسری
بجائے دہلے عرب کے پاؤں کی انگلیاں بہت پھیلی ہوئی تھیں اور اس کے پاؤں کے ساتھ
تقریباً دو یا تین بار ہی تھیں۔ ربیعوں نے اپنے حریف کو نظر انداز کئے بغیر مجھ سے
پوچھا:

”میں اسے ہاؤں؟“

میں نے ایک دم سوچا کہ اگر میں نے مذکورہ تو وہ کہیں اشتعال میں آکر اُسے
نشانہ بنا دے۔ میں نے اسے صرف یہ کہا:
”اُس نے ابھی تم سے کوئی بات نہیں کی۔ اگر تم یونہی اُس کو نشانہ بنا دو گے،
تو مرزا دار کھڑے ہو گئے۔“

پھر پانی اور بائسری کی ایک کچی سی آواز گرم اور خاموشی لٹا کی موجوں پر بہتی
ہوئی کانوں میں چڑی۔ ربیعوں نے کہا:

”اب میں اسے گالی بگنے لگا ہوں۔ اگر اُس نے مجھے ٹھٹھکا کر جواب دیا تو میں اس
پر پل پڑوں گا۔“

میں نے جواب دیا:

”ٹھیک ہے لیکن اگر اُس نے اپنا خنجر نکالا تو تم گولی نہیں چلاؤ گے۔“

ربیعوں کو کچھ پیش آنے لگا۔ دوسرا عرب بائسری بھانار اور دونوں ساتھیوں پر
کی ہر حرکت کو فوراً دیکھتے رہے۔

”نہیں؟“ میں نے ربیعوں سے کہا: تم یوں رہو اور مجھ سے دو اور دہلیز طرف
دہلے عرب سے: تعاقب کی کرو۔ اگر دوسرے نے مداخلت کی یا اُس نے اپنا خنجر

نکالا تو میں اسی پر راز کر دوں گا۔

جب ربیعوں نے مجھے اپنا رویہ دیا تو اس پر بخاری کی شعا میں پڑ رہی تھیں۔ ہم
برحال اس طرح ساکت رہے جیسے کہ کھارے ارد گرد کا ماحول ہمیں قید بند کے عالم
میں گھیرے ہوئے ہے۔ ہم حرف ایک دوسرے کو دیکھ سکتے تھے انہیں جھکاتے
بغیر۔ کچھ یوں معلوم ہوتا تھا کہ سمندر اور سڑک کے درمیان ریت کے اسی مغز سے
مختر سے پر ماری زندگی اگر رک گئی ہے۔ ذی اور بائسری کی دوسری خاموشی۔

میں نے اس وقت سوچا کہ گولی چلائی جا چے یا نہیں۔ مگر عرب ایک دم پیچھے ہٹ
گئے اور چٹان کی آڑ میں چھپ چکے کی طرح چھپ گئے۔ ربیعوں اور میں دونوں مڑے اور پھر
سے اپنی راہ لگے۔ اب وہ ذرا بہتر محسوس کر رہا تھا اور میں پر واپس جانے کا ذکر کر رہا
تھا۔ میں اُس کے ساتھ جھگڑا کر گیا۔ جب وہ کھڑکی کی سیڑھیوں پر چڑھ رہا تھا تو میں
پہلی ہی سیڑھی کے ساتھ ٹک گیا۔ میرا دوسرا عرب کے مارے چکر مار رہا تھا اور مجھے
ہمت نہیں پڑ رہی تھی کہ کھڑکی کی سیڑھیوں پر چڑھ کر ایک منزل طے کرنے کی کوشش کروں
اور پھر رتوں سے نشیون۔ مگر گولی کچھ ایسے غصہ کی تھی کہ آسمان سے برسی ہوئی
آگ کے نیچے ساکت کھڑے رہنا بھی عذاب جانی تھا۔ یہیں زکون یا آگے بڑھوں۔
بار بار یہی خیال آ رہا تھا۔ ایک لمحہ کے بعد میں سمندر کی طرف لوٹ آیا اور میں نے
پیدل چلنا شروع کر دیا۔

جہاں تک کچھ پہنچتی تھی وہی شریخ روشنی تھی۔ گرم ریت پر سمندر کا سانسی
بھول رہا تھا اور اس کی جھوٹی جھوٹی لمروں کا دم گھٹ رہا تھا۔ میں نے چٹان کی طرف
ہوئے ہوئے قدم اٹھانا شروع کیا۔ میں نے محسوس کیا کہ میرا تھا دوسرا عرب سے

سورج رہا ہے۔ گرمی بھر پر حملہ آور ہو رہی تھی اور میرے قدم روک رہی تھی ہر مرتبہ جب میں اپنے چہرہ پر شہید گرمی کا ریزہ محسوس کرتا تو قریب اپنے دانت پیچھتی دیکھتا تھا کی جیب کے اندر اپنے ہاتھ کے کی صورت میں بند کرتا اور اپنے سارے اعصاب کو گرمی سے بچانے کی خاطر کھینچ لیا۔ آسمان سے آگ برسی رہی تھی جس میں میرا جسم جھلس رہا تھا۔ ریت سے آنسو دالے گرمی کے ہر ریلہ پر جوششیر کی تیزی سے آتا میرے بڑے ایک سفید پیچھی یا توڑے ہوئے شیشہ کی طرح سکڑ جاتے مگر میں ڈاٹلٹھ والا تو نہیں تھا۔ یہی بہت دور پہتا رہا۔

میں نے دوسرے دیکھا کہ چھوٹی سی گہرے رنگ کی چٹان کے ارد گرد سورج کی روشنی اور سمندر کی جھاگ سے ایک چمکدار حلقہ سا بن رہا ہے لیکن مجھے پہاڑی کے پیچھے تازہ اور ٹھنڈے پانی کی ندی کا خیال آیا۔ میرا ہی چاہتا تھا کہ اسی کے بجتے ہوتے پانی کی نرم اور مترنم آواز سننے لوٹ جاؤں تاکہ سورج سے چٹان ٹلی سکے۔ مجھے غور توں کا دماغ بھی یاد آیا اور آنکھوں کا چارہ گا کہ کوئی سایہ ڈال کر دیا اس کے تلے آرام کروں۔ میں یوں کر تلے ہی والا تھا کہ میں نے دیکھا کہ ریموں کا دشمنی لوٹ آیا ہے۔

اب کی مرتبہ دو تھکا تھا۔ اسی نے کمر ٹیک رکھی تھی۔ ہاتھ گردن پر تھے منہ پہاڑی کے سامنے ہیں اور سارا جسم دھوپ میں اس کا نیلا لباس گرمی میں محسوس ہوتا نظر آ رہا تھا۔ مجھے ذرا تعجب ہوا۔ جہاں تک میرا تعلق تھا۔ میں سمجھتا تھا کہ جنگلات، ختم ہو چکا ہے۔ اور میں بے دھیان و ازان چلا آیا تھا۔ مجھے دیکھتے ہی عرب ذرا اٹھا اور اپنی جیب میں ہاتھ ڈالے۔ طبعی طور پر میں نے ریموں کا رونا دھنا سنا، جو

میری اسلٹ کی جیب میں تھا۔ پھر تھکے مرسے سے دو پیچھے ہٹا مگر ہاتھ جیب سے نہ نکلائے۔ میں اس سے کافی دور تھا، کوئی دس گز کے فاصلہ پر۔ مجھے کبھی کبھی اس کی آنکھیں جو اس کی گھٹی بھڑوڑ میں دھنسنی ہوئی تھیں، دکھائی دیتیں۔ مگر جیشتر اس کا چہرہ میری آنکھوں کے سامنے رقص کرتا رہا۔ ایسی فحاشیاں میں بہن ششے بھڑک رہے تھے، بہنوں کا شراب بھر دھینچا ڈالیا۔ دوپہر سے سبھی نے زیادہ دھیان۔ وہی سورج تھا، وہی ریت اور وہی دھوپ۔ وقت طویل کھینچ رہا تھا۔ دو بج چکے تھے، مگر وہ اب بھی دھوپ نہیں دے رہا تھا۔ یوں معلوم ہوتا تھا کہ وقت نے گھبھے ہوئے دھات کے سمندر میں ٹھکر ڈال دیا ہے۔ دور آتی پر کوئی جواب دیکھ نہیں سکتا۔ ایک جگہ سا بولی کا ٹکڑا گزر جاتا اور دیکھتا تھا کہ ایک میاؤ مکتہ میری آنکھوں کے سامنے آگیا ہے کیونکہ میں عرب کو مسلسل ٹھکی ہا رہے دیکھ رہا تھا۔ میں نے سوچا تھا کہ میں اور قدم میں برا سفر ختم ہو جائے گا مگر سمندر کو گن رہا تھا کہ دھوپ میں کب رہا تھا ختم ہونے کا نام ہی نہ لیتا تھا۔ میں نے ندی کی طرف چند قدم بڑھا دیے۔ عرب نہ ڈنکا، نہ ہارے۔ درمیان ابھی کچھ فاصلہ باقی تھا۔ شاید اسی نے کہ اس کے چہرے پر سایہ تھا۔ یوں معلوم ہوتا تھا کہ وہ مجھ پر جسٹ رہا ہے۔ میں انتظار میں رہا۔ سورج کی تپش نے میری گالوں کو جلان شروع کیا اور میں نے محسوس کیا کہ میرے سارے بدن پر پسینہ کی بوندیں جمع ہو رہی ہیں۔ یہ گرمی بالکل دھنسی ہی تھی جیسے کہ اتنی کے جنازہ کے دن راج بھی اسی دن کی طرح ہاتھ میں لے لے سب سے زیادہ دور ہو رہا تھا اور بدلے کے نیچے تمام گرمی زور سے پھڑپھڑا رہی تھیں۔ یوں معلوم ہوتا تھا کہ وہ ابھی گھٹنے گر چیں۔

گرمی اب اتنا جلیبڑا شست ہو چکی تھی۔ میں نے سامنے کی طرف ایک قدم اٹھایا

(۷)

میری گرفتاری کے فوراً بعد مجھے سے کئی بار پوچھ گچھ کی گئی۔ تفتیش کرنے والے میری شخصیت اور نام و نشان کے متعلق تقریباً مدد رسائی کرتے اور پوچھ جاتے۔ پہلی مرتبہ تو مجھے یوں محسوس ہوا کہ تمنا ہے یہ کسی کو میرے مقدمہ میں دلچسپی نہیں ہے۔ لیکن اسی کے آخر روز بعد جب مجھے محشریٹ کے سامنے پیش کیا گیا تو اس نے مجھے بہت توجہ اور غور سے دیکھا۔ لیکن شروع میں اس نے صرف مجھ سے میرا نام، پتہ، پیشہ، پیدائش کی تاریخ اور گھر اور ذات کی پھر اس نے پوچھا کہ کن میں سے کوئی دیکھ کر لیا ہے؟ میں نے جواب دیا کہ نہیں:

میں نے سوال کیا:

دیکھ کر نا لازمی ہے؟

”آپ کا مطلب؟“ وہ چمکا۔

میں نے جواب دیا:

”مجھے اپنا مقدمہ بہت سیدھا سا در معلوم ہوتا ہے۔“

وہ یہ کہتے ہوئے مسکرایا:

میں جانتا تھا کہ یہ حاکم کی بات ہے۔ کیونکہ ایک قدم اٹھانے سے مجھے گرمی سے نجات دہی سکے گی، اگر میں نے ایک قدم اٹھایا۔ صرف ایک قدم سامنے کی طرف اور پھر بغیر اٹھے عرب نے اپنا منہ نکالا جو دھوپ میں چمکا۔ نو لاد کی دھار سے مروج کی شعاع نکلے اور لہا چمکیا۔ پہلے مجھے سامنے دکھائی دیا اور مجھے محسوس ہوا کہ وہ پیسے ماتھے پر پیوست ہو گیا ہے۔ پسینہ جو میرے اردوں پر جمے ہوئے تھا ایک دم میرے پتھروں پر پہنچ گیا اور ان پر ایک نیم گرم بھاری سا پردہ پڑ گیا۔ میری آنکھیں کھلیں۔ آنکھوں کے سیلاب میں غرق ہو گئیں۔ مجھے اب اپنے منہ پر مسکراتے کھانچوں کے سوا اور کچھ محسوس نہ ہوا۔ تمنا۔ خبر کی خبر کی چمک۔ مبہم طور پر میرے سامنے تھی۔ یہ چمکتی ہوئی شمشیر میرے پتھروں میں چبھ رہی تھی اور میری دھمکتی ہوئی آنکھوں میں دھنسل رہی تھی۔ یہ ابھی ایک دھندلا سا خاکہ تھا۔ پھر میری آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا گیا۔ سندھ میں ایک تہذیبی طوفان اٹھا۔ یوں معلوم ہوتا تھا کہ سارا آسمان پھٹ پڑا ہے اور ہر جگہ اس سے آگ برس رہی ہے۔ یہ ہر تہذیبی تہذیب کے عالم میں تھا۔ یہ نئے رویوں اور کو اپنے اند میں دبا دبا اس کا گھوڑا اپنی جگہ سے ہلا۔ یہ نئے چمکتی ہوئی نشانے کی کھجور کو چھوڑا اور ان کی دہائی میں ایک شورش زدہ ماحول سے کالی پھٹ رہے تھے۔ یوں سب کو شروع ہوا۔ میں نے پسینہ پونچھا۔ میں سمجھا کہ میں نے وقت کے توازن کو تباہ کر دیا ہے۔ مسند کے کنارے جہاں اب تک ایک غیر معمولی خاموشی طاری تھی اور میں بڑے غصے میں تھا اب بات ہی اور ہو چکی تھی۔ میں نے پھر مارا دھوڑا گئی چلائی، ایک ایسے جھبیر سے جو حرکت نہ کرے جہاں گریبان گہرے ہی نہیں اور اسے کچھ محسوس نہیں ہوتا تھا۔ یہ یاد مختصر گھر گھر تھے تھے جو میں نے برہنہ کے دروازے پر سے رکھے۔

”یہ آپ کی راستہ ہے۔ بہر حال قانون کا تقاضا اپنی جگہ قائم ہے۔ اگر آپ اپنا وکیل نہیں کریں گے تو مجھیں سرکاری وکیل نامزد کرنا ہوگا۔“
میں نے اُس سے کہا:
”اگر قانون یوں سب تقاضیات کی تاکید اور نگرانی کرتا ہے تو یہ تو بڑے نقصان کی بات ہے۔“

اُس نے مجھ سے اتفاق کیا اور کہا:

”اُن قانون بہت خوب وضع کیا گیا ہے۔“

پچھلے تیس دنوں میں جو سچا کہ وہ سفید نہیں ہے۔ اُس کے یہاں میری پیشی ایک کمرہ میں ہوئی جس میں پردے کھینچے ہوئے تھے۔ اُس کے میز پر صرف ایک میپ تھا۔ جس کی روشنی اُس کو سیاہ پڑ رہی تھی جس پر مجھے بیٹھنے کو کہا گیا تھا۔ اُس کا اپنا چوڑا کیڑا تھا۔ میں نے کتا بویں اُس قسم کے منظر پر دیکھے تھے اور یہ سب مجھے ایک مصلح ما معلوم ہو رہا تھا۔ چاروں انگٹھوں کے بعد میں نے اسے غور سے دیکھا تو پتہ چلا کہ اُس کے نقش بڑے کیچھے ہیں۔ نچلی نچلی گری انکھیں، شدت قامت، دمی اور گھنی سفید روئیں اور کھڑے ہونے کے سر کے بال جو برف کی طرح سفید تھے۔ وہ مجھے بہت متعلق آدمی لگا۔ ہڈیوں اور ٹھنڈی کی خصوصیات نے اُن کے بشرے پر شفقت کا تاثر پیدا کر دیا تھا صرف ایک چیز مجھے اچھی لگی۔ اعصابی درد سے اُس کے منہ پر لگے گئے مکرشے کی ایک مضطرب کیفیت پیدا ہو جاتی تھی اور اُس کا چہرہ صبر معلوم ہوتا تھا۔ لکھتے ہوئے میں اُس کی طرف ہاتھ بڑھانے ہی کو تھا کہ مجھے یاد آیا کہ میں تو ایک ناواقف ہوں۔

اگلے دن ایک وکیل میں سے ملنے آیا۔ وہ پست قد اور گول مٹھل تھا۔

خدا پر شکر کہ اسے ہائی اسٹیٹ لاء سے سزا دے دی گئی۔ گرمی کے باوجود میں قیصر بنے ہوئے تھا، وہ مجھ سے رنگ کا سوٹ پہنے ہوئے تھا۔ سخت کار اور ایک اوٹ چانگ شرف قسم کی گاڑی میں میری بڑی گاڑی کا لی اور سفید دھاریاں تھیں۔ اُس نے اپنا قصیدہ وجود بغل میں دبائے ہوئے تھا میری چارپائی پر رکھ دیا۔ اپنا تھکاوٹ کر دیا اور مجھ سے کہا کہ اُس نے میرے منتظر کے کفالت کا معاملہ کیا ہے۔ میرا معاملہ نازک ہے۔ گھر سے کوئی شہر نہیں کر اگر میں نے اس پر اتفاق کیا تو ہم مقدمہ ہیٹ جا رہے گے۔ میں نے اُس کا شکریہ ادا کیا اور اُس نے مجھ سے کہا:

”وہ معاملہ کیڑا کوڑا نہیں ہے۔“

وہ چارپائی پر بیٹھ گیا اور مجھے بتایا کہ میری ذاتی زندگی کے متعلق اطلاعات حاصل کی گئی ہیں۔ یہ تو اُسے معلوم ہی تھا کہ میری ماں عالی ہیں میری بڑی سروس کی۔ اُن کی ماں میں مری ہے۔ پھر بھی اُس نے ہانگوں جاکر تفتیش کی۔ تحقیقات کرنے والوں کو پتہ چلا کہ میں نے اُن کی دکان کے دن بے حس اور دنگل ہونے کا ثبوت دیا تھا۔

”آپ جانیں؟“ میرے وکیل نے مجھ سے کہا۔ ”مجھے آپ سے یہ پوچھتے ہوئے کہیں ابھی سے محسوس ہوتی ہے کہ یہ بات بہت اہم ہے اور اگر مجھ سے اُس کا جواب نہیں آیا تو استغاثہ کو بڑی نفرت حاصل ہوگی۔“

وہ چاہتا تھا کہ میں اُس کی مدد کروں۔ اُس نے مجھ سے پوچھا کہ کیا اُس دن مجھے کچھ تم محسوس ہوا تھا۔ اس سوال پر میں بہت حیران ہوا۔ اور مجھے یوں محسوس ہوا کہ اگر مجھے کسی کو یہ سوال پوچھنا ہوتا تو مجھے بہت خرم محسوس ہوتی۔ بہر حال میں نے جواب دیا کہ کچھ محسوس مجھے اپنے نفس کا تجزیہ کرنے کی حالت میں ہوا تھا۔ لہذا میرے

نے بہت خشکی ہے کہ میں آپ کو اس ضمن میں کچھ اطلاعات بہم پہنچاؤں۔ بے شک مجھے اتنی سے بہت محبت تھی مگر یہ تو بے صفتی بات ہے۔ سب ذی فہم، سمجھدار لوگ اپنے عزیزوں کی موت کی کبھی نہ کبھی کم و بیش تنقید کیا ہی کرتے ہیں۔ بیان دیکھنے ٹوکا۔ وہ بہت پریشانی نظر آ رہا تھا۔ اُس نے مجھ سے وعدہ کیا کہ میں ایسی بات عدالت میں نہیں کروں گا۔ بہر حال میں نے اُسے وضاحت سے بتایا کہ میری فطرت ہی ایسی ہے کہ میری جسمانی حالت میرے جذبات اور احساسات کو اکثر پرانگندہ کر دیتی ہے۔ جس دن میں نے اتنی کو دن کیا تھا اس بہت تھکا ہارا تھا اور مجھ پر شدید غائب آ کر چلنے کچھ اس طرح کہ اب میں بیان نہیں کر سکتا کہ اسی دن مجھ پر کیا گزری۔ میں پوسے بغیر صرف یہی کہہ سکتا ہوں کہ میں اسی کو ترجیح دیتا کہ اتنی سرے سے فوت ہی نہ ہوئی مگر یہ دیکھ مطلقاً نہیں معلوم ہوتا تھا۔ اُس نے مجھ سے کہا:

”یہ تو کافی نہیں ہے۔“

دو سوچ میں پڑ گیا۔ پھر مجھ سے پوچھا:

”کیا وہ یہ کہہ سکتا ہے کہ اُس دن میں نے اپنے قدرتی جذبات کو دبا کر رکھا تھا؟“

میں نے کہا:

”نہیں! کیونکہ یہ بات غلط ہے؟“

اُس نے مجھے ایک عجیب نفرت آمیز طریقے سے دیکھا اور تعجباً غناؤ کے

انداز میں کہا:

”بہر حال ہسپتال کے ڈائریکٹر اور غلام گرامی دیں گے اور ان کے بیان سے

میرا ہٹا پھوٹ جائے گا۔“

میں نے اُس سے کہا:

”اس کہانی کا میرے مقدمے کوئی تعلق ہی نہیں۔“

لیکن اُس نے صرف مجھے یہ جواب دیا:

”صاف ظاہر ہے کہ تجھے کبھی عدالت سے واسطہ نہیں پڑا۔“

وہ دفعہ کے عالم میں رخصت ہو گیا۔ میں چاہتا تھا کہ اُسے روکوں اور سمجھاؤں

کہ مجھے اس کی حدود دی کی ضرورت ہے۔ اس نے نہیں کہ وہ میری اچھی طرح غور و خفا

کرے گا مگر یوں کہنے کہ صحت اس لئے کہ یہ ایک قدرتی تقاضا ہے۔ مگر ستم بہرا کہ

میں نے اسے پریشانی کر رکھا تھا۔ وہ مجھے سمجھ نہ پایا مگر وہ چاہتا تھا کہ مجھے کچھ

سمجھے۔ مجھے یہ خواہش تھی کہ وہ اس بات کی تصدیق کرے کہ میں دوسرے لوگوں کی

حقوق میں سدا آدی ہوں۔ مگر وہ حقیقت یہ سب کچھ بے فائدہ تھا اور میں نے بعض

سستی سے اسی بات کی پیروی نہیں کی۔

کچھ عرصہ بعد مجھے جوش ریت کے سامنے پھر سے پتہ کیا گیا۔ دوپہر کے دو بجے

تھے۔ اسی مرتبہ اسی لاٹرو روشنی سے بھر پور تھا اور اسی لاٹرو پر وہ نہ جانے کے برابر

تھا۔ گرمی بہت تھی۔ اُس نے مجھے پیچھے سے کھڑا کر دیا اور بڑی تنہیب سے مجھے بتایا کہ میرا وکیل

کس دوسرے آدمی تک پہنچ نہیں سکا لیکن مجھے حق حاصل ہے کہ میں دیکھ کے اُس تک کسی

سوال کا جواب نہ دوں۔ میں نے کہا:

”میں تنہا جواب دے سکتا ہوں۔“

اس نے میز پر انگوٹھی سے ایک جھک کر دیا۔ عدالت کا ایک جرائن نشی میرے پیچھے

آ کر بیٹھ گیا۔

محشر ٹیٹ اور میں — ہم دونوں بازو والی کرسیوں پر بیٹھے ہوئے تھے اڑ
یوں معلوم ہوتا تھا جیسے کسی فریم میں جکڑ دیئے گئے ہیں۔ سوال جواب شروع ہوتے
اس نے پہلے کہا کہ بیان کیا گیا ہے کہ میں بہت کم گرا اور ساکت قسم کا آدمی ہوں۔
وہ معلوم کرنا چاہتا تھا کہ اس بار سے میں میری کیا رائے ہے۔ میں نے جواب دیا
”نہیں! واقعہ یوں ہے کہ میرے پاس کسی زیادہ باتیں کہنے کو راستیں۔ لہذا
میں چھپ چاپ رہا ہوں۔“
وہ پہلی مرتبہ کی طرح مسکرایا اور بھانپ گیا کہ میری دلیل معقول ہے۔ پھر اُس
نے کہا:

”بہر حال اس کی کوئی اہمیت نہیں۔“

وہ خاموش چر گیا۔ مجھے دیکھتا رہا اور پھر اٹا کانا بہت تیزی سے اُس نے کہا:
”جس بات میں مجھے دلچسپی ہے وہ آپ کی ذات ہے۔“
میں ٹھیک طرح سمجھ نہ سکا کہ اُس کا مطلب کیا ہے اور میں نے کچھ جواب نہ دیا۔
”بہت سی باتیں ہیں، اُس نے مزید کہا۔ جو آپ کے مقدمہ میں میری سمجھ میں
نہیں آتی۔ مجھے یقین ہے کہ آپ انہیں سمجھنے میں مدد کریں گے۔“
میں نے کہا:

”بات سب سے آسان ہے۔“

اُس نے اصرار کیا کہ میں اس سفر میں سے بیان کروں۔ میں نے پھر سے وہی
بیان دہرایا جو پہلے دے چکا تھا — دیو، ساحل، پہلا تیرنا، جھگڑا، پھر ساحل،
چھوٹی کادی، سورج اور لڑکوں کے پانچ وار۔ ہر جگہ وہ کہتا رہا ”خوب! خوب!“

جب میں یہاں کے آخری کیمپ پہنچا تو اُنہیں نے تو صغیر انداز میں کہا:

”خوب۔“

میں ایک ہی کہانی دہرا دہرا کر جھکان ہو چکا تھا اور مجھے یوں محسوس ہو رہا تھا کہ
زندگی میری نے پہلے کسی اتنی باتیں نہیں کیں۔

کچھ خاموشی کے بعد وہ اٹھ کھڑا ہوا اور مجھے کہا کہ وہ میری امداد کرنا چاہتا
ہے۔ میں اسے دلچسپ آدمی معلوم ہوتا ہوں اور فدا کی مدد شامل حال رہی تو میرے
لئے فزور کہہ کر کہہ گا۔ مگر وہ چاہتا تھا کہ پہلے مجھ سے چنانچہ ایک سوال کرے۔ ایک
نور کے بیڑا کی شکل میں تھا کہ کیا مجھے واقعی اتنی سے محبت تھی۔ میں نے کہا:

”ہاں: جیسے سب کو ہوتی ہے۔“

عدالت کا دشمنی جواب ملک اپنی مشین پر باقاعدہ ٹائپ کر رہا تھا، اپنی چال بکری
گیا۔ کیرکروہ لو کہتا تھا۔ اب مجھ کو اسے آخری حصہ کو پھر سے ٹائپ کرنا پڑا۔
پھر محشر ٹیٹ نیز کسی واقعہ خلق کے بعد سے ابھی رہتا رہا کہ میں نے یوں اور سے کیا
دم پاؤں گویا کہیں پناہ دی تھیں۔ میں نے سوچا اور بے کم و کاست کہا:
”میں نے صرف ایک گولی چلائی تھی اور پھر کچھ لمحوں کے وقفے کے بعد باقی چلا۔“
”آپ پہلے اور دوسرے وار کے درمیان کون کون گئے تھے؟“ اُس نے پھر
پوچھا۔

پھر ایک تہہ بھری آنکھوں کے سامنے وہی شرف ساحل آگیا اور میں نے اپنے ہاتھ
پر سونے کی تپن محسوس کی۔ گرجا کی باہر میں نے کچھ جواب نہ دیا۔ اس خاموشی کے دوران
محشر ٹیٹ بہت پریشان معلوم ہو رہا تھا۔ وہ ہمیشہ ہوتا تھا اُس کے ہال پر آگندہ تھے۔

اس کے دفتر میں بڑی بڑی کمپیاں تھیں جو مجھ پر آکر میوڑ دی تھیں۔ اور پھر یہ بھی وجہ ہے کہ انہیں نے مجھے کچھ ڈراما سنا دیا تھا۔ ساتھ ہی مجھے یہ بھی خیال آیا کہ یہ ڈرامے غصوں اور بے معنی ہے کیونکہ آفرکار میں ملازم تو ہوں ہی۔ اس نے تقریر جاری رکھی۔ میں تقریر جاری سمجھا کہ اس کی رائے میں میرے اقبال پر جو میں صرف ایک ہی نکتہ سمجھتا ہوں یعنی یہ کہ میں روبا اور سے دوسرا وار کرنے سے پہلے کیوں رک گیا تھا۔ باقی بیان واضح ہے لیکن یہ نکتہ وہ نہ سمجھ سکا۔

میں کہنے لگا ہوا تھا کہ وہ خواہ مخواہ ضد کر رہا ہے۔ اس نے آخری نکتہ کی تو کوئی اہمیت ہی نہیں۔ مگر اس نے جملہ جملے جو اسے آخری مرتبہ سمجھا دیا ملازم میں بڑے رعب اور دبدبہ سے پوچھا کہ کیا میں خدا پر ایمانی رکھتا ہوں۔ میں نے جواب دیا کہ نہیں وہ بڑے فتنہ کی حالت میں پھر جیت گیا۔ انہیں نے مجھ سے کہا:

”یہ بالکل ناممکن ہے۔ تمام انجیل نوح انسان خدا پر ایمان رکھتے ہیں۔ مگر انہوں نے وہ بھی جو اس سے روگردانی کرتے ہیں۔ یہ اس کا عقیدہ تھا۔ اگر اس کی اس میں کبھی ذرہ بھر شک و شبہ ہوتا تو اس کی زندگی بے معنی ہو جاتی۔“

”کیا آپ چاہتے ہیں کہ میری زندگی بے معنی ہو جائے؟“ انہیں نے کہا۔
میری رائے میں تو اس سوال کا جواب تو کوئی تعلق نہ تھا اور میں نے یہی اس کو کہا دیا۔ وہ میرے شاہ اور میری تصویر میری آنکھوں کے سامنے کر کے ایک لامعنی طریق سے چلتا:

”میں مسمانی ہوں۔ میں سستہ سے قبور سے گناہوں کی معافی مانگتا ہوں۔ یہ کیسے

انہیں نے اپنی کئی چیزیں رکھی اور ذرا میری جانب جھکا جبکہ عجیب و غریب کیفیت کے ساتھ
”تو کیوں؟ آخر کیوں آپ ایک لاش پر گریباں چلاتے گئے؟“

ایک بار پھر مجھے کوئی جواب ہی نہ پڑا۔ برسرِ پٹ نے اپنے ماتھے پر ہاتھ پھیرا اور اپنے سواں کو بدلی آواز میں پوچھا:

”کیوں؟ آپ کو مجھے جواب دینا ہو گا۔ کیوں؟“
میں تمام وقت خاموش رہا۔

دو ایک ایک اٹھ کھڑا ہوا اور بڑے بڑے قدم سے کہ اپنے دفتر کے ایک کونے کی طرف بڑھا اور خاموشی کی افکاری کا ایک دروازہ کھولا۔ وہاں سے انہیں نے چاند کی ایک صلیب نکالی اور میری طرف بڑھتے ہوئے آئے گھمایا اور ایک بالکل بدلی ہوئی تقریر کا کشتہ برقی آواز میں چلا گیا:

”اس کو تم پہنچاتے ہو؟“
میں نے کہا:
”جی ہاں! سب شک!۔“
پھر انہیں نے بڑی تیزی سے جہاں باقی مجھے میرے کہا:

”میں خدا پر ایمان رکھتا ہوں اور میرا عقیدہ ہے کہ کوئی انسان آٹا گٹکار نہیں ہو سکتا کہ وہ خدا کی بخشش سے محروم ہو جائے لیکن لازم ہے کہ انسان امدادِ مذمت سے ایک معصوم بچے کی طرح رہ جائے تاکہ اس کی روح سب رمتوں کو قبول کر سکے؟
اس کا سارا جسم نیز پر جھکا ہوا تھا۔ وہ صلیب سے سامنے گھماتا رہا۔
سچی بات تو یہ ہے کہ میں اس کا مطلب نہ سمجھ پایا۔ آدلی تو گرمی بہت ملک رہی تھی پھر

عشرت بھرا نظر کھڑا ہوا۔ ایک اشارہ تھا کہ بحث ختم ہوئی۔ اُس نے تھکے ہوئے انداز میں بھر سے حرف بے چارہ کر کے کہا کہ میں نے فکر کیا اور اُس سے کہا کہ ذمہ داری تو کیا مجھے ایک گز بڑائی کا احساس ضرور ہوتا ہے بڑا خیال ہے کہ وہ میرا مطلب نہ سمجھ پایا۔ مگر آج کے دن کوئی بات ہی نہیں رہی تھی۔ اُس کے بعد میں اکثر محشریت کے سامنے پیش ہوتا رہا۔ فرق صرف یہ تھا کہ اب ہر بار میرے ساتھ میرا دل بڑا اور ساری بحث میرے چپے بیانی کے طرف چلنے پھرنے کو مائل کرنے تک محدود رہتی تھی یا تو کہنے کہ محشریت میرے دل سے فرو جرم پر بحث کرتا۔ مگر وہ حقیقت اب وہ میری ذات سے کوئی دلچسپی نہ تھا۔ بہر حال آہستہ آہستہ بحث کا بیج بدل گیا۔ یہی معلوم ہوتا تھا کہ محشریت کو اب میرے ساتھ کوئی ذاتی دلچسپی نہیں رہی اور اُس نے میرے مقدمہ کو تعزیرات کی کسی دفعہ میں ڈال دیا ہے۔ اُس نے پھر جو سے نوا کی بات نہیں کی اور میں نے پھر کسی اُن کو چپے دل کی ہی محشریت اور کھلی کی حالت میں نہ دیکھا تھا۔ نتیجہ یہ کہ مقدمہ کی سماعت ختم ہوئی گئی۔ معروف چند سوال میرے دل کے ساتھ تھوڑی سی گفتگو اور پھر باقی ختم۔ بقول محشریت کے میرا مقدمہ اب اپنی ڈاگر پر چل رہا تھا۔ کسی کسی جگہ گھٹو عام انداز کی جوتے تھے تو مجھے ذرا ملکیت اور پیشانی ہوتی۔ مجھے پسینہ آنے لگا۔ ان اوقات میں مجھے حسوں ہوتا کہ کسی کو مجھ سے دشمنی نہیں ہے۔ سارا ماحول بے تکلف ہے۔ ساتھ ساتھ، بات بظاہر اور باطنیت تھا سارا کھلی کھلا اس سبب کی سہولت جابجا تھا کہ مجھے یہ محسوس تھا کہ اُن کا کہیں بھی ایک کونہ ہی کا ایک فرد نہیں۔

مقدمہ کے گیارہ ماہ کے بعد میں کہہ سکتا ہوں کہ میں حیران ہوں کہ زندگی بھر

جو سکتا ہے کہ تم اُن پر ایمان نہ لاؤ جب کہ وہ تباہی بخانا صلیب پر چڑھا۔ میں نے فوراً کہا کہ اب وہ آپ کی بجائے مجھے ترسے گا۔ ہاں تھا لیکن میرے صبر کا پیمانہ بڑھ گیا تھا۔ پیش قدمی کی جگہ جاری تھی۔ میرا ہمیشہ یہ کہ دور دراز ہے کہ جب مجھے کسی سے چھٹا چھڑاتا ہوتا ہے تو میں اُن کی بات پر کان ہی نہیں دھرتا۔ مگر اسے یہ خیال ہوتا ہے کہ میں اُس سے اتفاق کر رہا ہوں۔ یہی حیران ہو گیا جب اُس نے ناگوار انداز سے کہا:

”دیکھا تم نے۔ دیکھا تم نے۔ کیا یہ صحیح نہیں کہ تم ایمان رکھتے ہو اور اب تم اُس کے سامنے توبہ کرنے والے ہو؟“

ظاہر ہے کہ میں نے پھر ایک مرتبہ کہا:

”نہیں۔“

وہ اچھی طرح کسی پر دھڑام سے گر پڑا۔ وہ بہت جگہ نظر آ رہا تھا۔ وہ ایک موصوفی شاعر کی طرح جرم سے ملنا کہ کھینچتی رہی آخری نعروں کو مٹھو کر دیتی تھی۔ پھر اُس نے مجھے ایک گز نہ فحیدہ دیکھا ہوں سے دیکھا۔ اُس نے آہستہ سے زیر لب کہا:

”میں نے کبھی تم جیسا سنگ دل انسان نہیں دیکھا۔ تمام فوج جرم سے سامنے پیش ہوتے ہیں ہمیشہ اسی صلیب کے سامنے دوڑتے ہیں کیونکہ یہ انسانیت کے دروازے ہیں۔“

میں جواب دینے والا تھا کہ میں اُس کے بارے میں سمجھتا ہوں جو فوج میں ہیں۔ میں نے سوچا کہ میں بھی تو اُن کی زندگی کے ذریعہ میں شامل ہوں مگر جرم ہونے کا یہ ایک خیال تھا جسے میں کسی طرح تسلیم نہ کر سکا۔

مجھے کبھی اتنی خوشی نہ ہوئی جیسی کہ میں ان ناداروں میں محسوس کرتا۔ جب جسٹریٹ مجھے
اپنے کمرے کے دروازے کی طرف پھینکا کر میرے کندھوں پر چسکی دیتا اور ایک دستا
انداز میں کہتا:

”دوبلے صاحب! آج کی کارروائی ختم ہو گئی ہے
اور پھر مجھے پولیس کے حوالے کر دیتا۔“



کچھ ایسی باتیں ہیں جن کا ذکر مجھے ہرگز کرنا نہیں ہے۔ جب یہ جیل میں آیا تو چند
ہی دن کے بعد مجھے احساس ہوا کہ اپنی زندگی کے اسی پہلو کے متعلق میں کبھی بات نہ
کرنا چاہوں گا۔ مگر کچھ عرصہ بعد یہ محسوس ہو گیا کہ اپنی زندگی بے بنیاد کی ہو گئی۔ اصلی
شرط کے ہندو مجھے نہیں ہیں جو نے کا احساس ہی نہیں تھا۔ ہمیں ظہر پر کسی نئے اور
خوف تو قیق واقعہ کا انتظار کرنا تھا۔ اصلی تعمیراتی کی پہلی اور آخری طاقت کے بعد
شرط ہوا۔ اس دور سے جب مجھے اس کا خط ملا اس نے لکھا تھا کہ مجھ سے ہر طاقت
کی اجازت نہیں لی گئی تھی کہ وہ میری بیوی نہیں ہے۔ اس دن سے مجھے احساس ہوا کہ
اب جیل کی کوٹھڑی میرا گھر ہے اور میری زندگی یہاں انکر رک گئی ہے۔ میری گرفتاری
کے دن انہوں نے مجھے ایک بڑے سے کمرے میں بند کر دیا جہاں پہلے ہی بہت سے
تبدیلی تھے جی میں سے اکثر عرب تھے۔ وہ مجھے دیکھ کر ہنسنے لگے۔ پھر انہوں نے مجھ سے
پوچھا کہ میں نے کیا کیا ہے؟ میں نے کہا:
”میں نے ایک عرب کو قتل کیا ہے۔“
دو فاموش ہو گئے۔ ایک لمحہ بعد شام ٹھہری۔ انہوں نے مجھے بتایا کہ جہاں

مزید سب پڑھنے کے لیے آج ہی وزٹ کریں: www.iqbalkalmati.blogspot.com

مجھے سنا ہے وہاں شاہی کوکر بچھا تا ہے۔ اگر ایک کونے کو پیٹ دیں تو وہ نکیر کا کام دے گی۔ ساری رات ٹھٹھل اور کڑے کھڑے میرے منہ پر دانت رہے۔ چند روز بعد انہوں نے مجھے ایک ٹینڈر کو ٹھٹھری میں ڈال دیا۔ وہاں میں کھڑی کے ایک تختہ پر سوتا تھا۔ میرے پاس ایک کوٹھڑا اور ایک تین کا تسلا میں شہر کے سب سے اونچے مقام پر تھی۔ وہاں سے میں اپنی چھٹی سی کھڑکی سے سمندر کو دیکھ سکتا تھا۔ ایک دن میں اپنی کوٹھڑی کی سٹاروں کو تھامے ہوئے کھڑا تھا اور میرا چہرہ روشنی کی طرف تھا جو پہلے سے ٹھیک رہی تھی کہ ایک سپاہی اندر آیا اور اُس نے کہا کہ میرا کوئی ملاقاتی آیا ہے۔ میں نے سوچا کہ یہ ماری ہوگی۔ چنانچہ وہی تھی۔

ملاقات کا کمرہ دُور تھا۔ پہلے ایک غلام گردش سے گزر کے میں ٹریٹر صوبہ تک پہنچا۔ پھر ایک اور ملہارا سستہ طے کرتے ہوئے ایک وسیع حال میں داخل ہوا جو ایک بڑی کھڑکی کی وجہ سے خوب روشنی تھا۔ وہاں کے دوڑے چھلکے ہائی کو لمبائی میں تین حصوں میں تقسیم کر رہے تھے۔ دو جنگلوں کے درمیان ۱۰ سے ۱۵ گز کا فاصلہ تھا جو قیدیوں کو قاتلانہوں سے علیحدہ کرتا تھا۔ میں نے اس اپنے سامنے دی کو پا پیا را کی کا باں و صمد ار تھا اور اس کا چہرہ گندمی۔ چھلکے کی میری طرف تقریباً دس قیدی تھے۔ جہاں میں ٹریٹر عرب تھے۔ ماری کی طرف اکثر عرب عورتیں تھیں۔ وہ دو عرب عورتوں کے درمیان کھڑی تھی۔ ایک طرف ایک چھٹی سی بڑھیا، سب سستہ، سیاہ لباس پہنے اور دوسری طرف ایک موٹی عورت جو بہت اُشار سے کر کے اونچی اونچی باتیں کر رہی تھی۔ چونکہ قیدیوں اور ملاقاتیوں کے درمیان فاصلہ نہ تھا۔ مجھے بھی اپنی آواز بلند کرنا پڑی۔ آواز بلند کا شہد ہائی کی بڑی بڑی رہنما واروں کے ساتھ کھڑا رہا تھا۔ نیز روشنی آسمان سے

چھٹی چھٹی کر کھڑکیوں سے گزرتی ہوئی ہائی میں ٹھیکس ہو رہی تھی۔ شاید یہی وجہ تھی کہ اندر آتے ہی میرا سر ہکا سا گیا۔ میری کوٹھڑی اندھیری اور بہت خاموش تھی۔ مہذا مجھے اس نئی فضا میں سنبھلنے کے لئے کچھ وقت لگا۔ کوٹھڑی دیہ کے بعد مجھے ہر پہلو میں غور پر دکھائی دینے لگا۔

میں نے دیکھا کہ سپاہی غلام گردش میں جنگلوں کے درمیان دونوں کونوں میں بیٹھے ہوئے ہیں۔ ٹریٹر عرب قیدی تھے اور ان کے رشتہ دار چھلکے کی دوسری طرف ان کے سامنے گھٹنوں کے بل بیٹھے ہوئے تھے۔ وہ چہا نہیں رہے تھے۔ شہر داخل کے باہر وہ ایک دوسرے سے آہستہ آہستہ باتیں کر رہے تھے۔ ان کی دلی ہوئی سرسبز ہفت جڑ کی بہت جھمی جو موٹی تھی، ایک سسل موسیقی کی جھنپنا ہٹ پیدا کر رہی تھی میرے سر چڑھے وہ باتیں کر رہے تھے۔ میں نے بہت جلد ہی اس سب چیزوں کا جائزہ لیا۔ اور ماری کی طرف ایک قدم بڑھا۔ اس کا سنوٹا ہوا چہرہ سٹاروں کو چھو رہا تھا اور وہ سکولانے کی بہت کوشش کر رہی تھی۔ اس خود وہ مجھے بہت لمبی اور گھٹن معلوم ہو رہی تھی لگیں مجھے اتنی عقل نہ آئی کہ اسے بھی یہ کہہ دوں۔

ہیلو! اس نے مجھے بہت بلند آواز میں پکارا اور اچھا تو تھا کیا حال ہے؟ سب ٹھیک ٹھاک ہے؟

میں نے کہا:

’ااں۔‘

پھر ہم دونوں خاموش ہو گئے اور ماری بدستور مسکراتی۔ یہی عورتی حرکت میرے جسم پر کی طرف جھک رہی تھی۔ وہ بادشاہ اس کا میان تھا۔ لاٹھا، گڑا چٹا، اسٹری ہائی،

اور گفتہ سا آدمی - مندرجہ ذیل ان کی گفتگو کا ایک نمونہ ہے جو پہلے سے ہی جاری تھی۔
 "جیسے اسے نہیں مینا چاہتی۔ وہ زور سے پتلاتی۔

"ہاں ہاں؟" آدمی نے عورت سے کہا؟ میں نے اسے کہا بھی ہے کہ تو
 نکلتے ہی میرے پاس لے آؤ گی۔ میری عمر وہ نہیں مانتی:

ماری اپنی طرف سے پتلاتی کہ میں نے مجھے سامنے لیا ہے۔ میں نے کہا:
 "شکریہ۔"

لیکن میری آواز میرے ہنسنے کی آواز پر گم ہو گئی جو پھر اٹھا کہ وہ
 شکیب تھا کہ ہے؟ کوئی عورت یہ کہتے ہوئے نہیں:

"اس کا حال کبھی اس سے بڑی زشتا۔"

میری بائیں طرف کا ہسیا ایک منحنی نچرنا قیدی تھا جس کے اترنوم ڈانک
 تھے۔ وہ بالکل خاموش رہا۔ میں نے سوچا کہ وہ ایک چھری سی چرمی کے متعلق کچھ تھا
 اور وہ دونوں ایک دوسرے کو شہت سے ترس رہی تھیں انھوں نے دیکھ رہے تھے مگر
 مجھے ان کو زیادہ حیرت دیکھنے کی فرصت نہ دی کیونکہ ماری نے پھر پتلا شروع کیا کہ مجھے
 امیہ کا دامن اٹھتے نہیں چھڑنا چاہیے۔ میں نے کہا:

"ہاں۔"

ساتھ ہی میں اس کی طرف دیکھ رہا تھا اور میرا جی پتا تھا کہ اس کے نفسی
 لباس میں اس کے کاغذ صوفیوں کا پتلا رکھوں اور اس کے جسم کو چھووں۔ اس کے سوا
 اور میری خواہش کیا ہو سکتی تھی۔ ماری کو بھی اس سے اتفاق معلوم ہوتا تھا کیونکہ وہ
 میری طرف دیکھ کر سارا وقت مسکراتی رہی۔ میں صرف اس کے دانقوں کی چمک اور اس

کی آنکھوں کے نیچے چھری چھری چھری دیکھ رہا تھا۔ ماری پھر سے پتلاتی:
 "انٹار اٹھ کر آ جا رہا ہے گا۔ اور پھر ماری شادی ہو جائے گی۔"

میں نے کہا:
 "تجربہ یقینی ہے؟"

مگر یہ جہد میں نے ممکن کوئی بات کرنے کی خاطر کہہ دیا تھا۔ اس نے پھر بہت
 جلدی اور بڑا آواز میں کہا:

"ہاں! تم رہا ہو جاؤ گے اور ہم دوبارہ انوار کا ایک ساتھ تہا بن جائیں گے۔"
 مگر دوسری عورت نے جھلک کی اپنی طرف سے پتلا کر اپنے میں کہہ کہ وہ ایک

فوکری باہر چل کی ٹیڑھی میں اس کے سے چوڑائی ہے اور پھر اس نے گفت شروع کیا کہ
 فوکری میں اس نے کیا کیا رکھا ہے۔ اس نے اسے تکیہ کی کہ سب چیزیں فیکس سے

دیکھ لینا کہ وہ بہت قیدی ہیں۔ میں اور میرا ہسیا اور اس کی ان اچھی تک ایک دوسرے
 کو سو گارڈناز میں دیکھ رہے تھے۔ جہاں سے قیدیوں کی کھٹکھٹیں تمام وقت جاری

رہی۔ باہر بڑی کھڑکی پر روشنی تیز پڑ رہی تھی۔ میری طبیعت کچھ خوب ہو رہی تھی اور میں
 رخصت ہونا چاہتا تھا۔ شہر سے میرا راجاں برداشت تھا۔ مگر دوسری طرف میں یہ بھی چاہتا

تھا کہ ماری کی سوجھ بوجھ کا نادمہ تھا۔ میں نے مجھے معلوم نہیں کہ وقت کیونکر گزر گیا۔ ماری خود
 سے اپنے کام کی باتیں کرتی رہی اور مسلسل مسکراتی رہی۔ غن فضا وہ چیم ڈھال رہا تھا۔

جیت اور میرا ہٹ سب کی ہاں آ میزش جاری رہی۔ صرف خاموشی کا ایک جزیرہ میرے
 پہلو میں تھا۔ ایک پست قد جوان آدمی اور چرمی جو ایک دوسرے کو تک رہے تھے

آہستہ آہستہ انھوں نے عربوں کو ایک ایک کر کے سے جہاں شروع کیا اور جہاں پہلا آدمی

رخصت ہوا۔ تقریباً سب پر غرضی چلائی۔ منشی برصا بھی سدا خون پر چمکی ہوئی تھی کہ یہی
نے اُس کے بچے کے کندھے پر چمکی دی۔ اُس نے کہا:

”خدا حافظ آتی!“

اور جیسا کہ خدا حافظ کرنے کے لئے ہاتھ سلاخوں کے پیچ میں ڈال دیا اور
وہ رنگ دہی کھڑی رہی۔

وہ کئی ہی چمکی کر ایک اور آدمی آخر میں ٹوپی سے اسی کی جگر اکٹھا ہوا۔ میرے
پاس جو خالی جگہ تھی وہاں کوئی ایک تیدی کو اندر نہ دیا۔ وہ اُس سے پرتاک میں کہنے
لگا کہ یہی وہی آدمی ہے کہ گھر میں اب قہقہہ مٹا رہی تھی۔ کوئی میرے دائیں طرف
کے ہمسائے کو سے جانے لیا۔ اسی کی بیوی بدستور چلا رہی تھی کہ اُس نے محسوس
ہوئی نہیں کیا کہ اب جینے کی ضرورت نہیں رہی۔ وہ کہہ رہی تھی:

”اپنا خیال خوب رکھنا۔“

پھر میری باری آئی۔ اسی نے اشارہ کیا جیسے کہ وہ مجھ سے بٹل گیر چورہی
ہے۔ وہ ساکت کھڑی تھی۔ اسی کا منہ جھکے کا سہارا لے رہا تھا اور اسی کی سسکاہٹ
میں ایک مصائبیت اور پریشانی تھی۔

چند روز بعد اُس نے مجھے ایک خط لکھا اور یہی ابتدا تھی اسی کیفیت کی کہ
کے متعلق میں کسی سے بات کرنا نہیں چاہتا۔ بہر حال سب کچھ کرنے کی کوئی ضرورت نہیں
اور آخر دوسروں کی نسبت مجھے تکلیف بھی کم تھی۔ تیکہ شروع شروع میں مجھے جو بڑی
مشکل پیش آئی وہ یہ تھی کہ میرے خیالات ایک آزاد انسان کے تھے۔ مثال کے طور
پر میرا چاہتا تھا کہ سارا کچھ نہ سے جلا ہواؤں اور سمندر کی طرف اتر جاؤں۔

اپنے دھیان میں پہلی بھڑوں کے شور کو اپنے پاؤں تلے محسوس کرنے تھا کہ ایک دم مجھے
خیال آتا کہ جیلا سمندر میری طرف تھا نہیں ملتا ہوا تھا۔ یہ کیفیت کئی مہینے
رہی۔ اسی کے بعد میرے خیالات ایک تیدی کے خیالات بن گئے۔ میں ہر روز اوقات
کا انتظار کرنے لگا۔ جب کہ نظروں کے باہر وہاں میں قیدیوں کو سڑکی اور پہلی قدرتی
کی اجازت تھی ہے یا نہیں میں اپنے دل کو منتظر تھا۔ دوسروں کی طرف میرا وقت بھی
اسی طرح گزرنے لگا۔ مجھے اکثر خیال آتا کہ اگر کبھی مجھے ایک خشک درخت کے تنے
میں زندگی بسر کرنا پڑے تو مجھے اس کی بھی اہمیت اہمیت عادت ہو جائے گی اور کسی
دوسری مصروفیت۔ شغل اپنے سر کے اوپر اُسی کی جھٹ کر دیکھنا۔ کیا حیرت
ڈرے گی۔ میں پرندوں کی پرانہ، اوجوں کے گزرو کا انتظار کرتا رہتا اور اپنے دل
کا منتظر رہتا جس کی تائید عجیب وضع کی تھیں۔ ایک دوسری دنیا میں میں ٹرے صبر
سے اتار کا انتظار کرتا تھا کہ اسی دن وہی سے ہم آغوش ہو سوں۔ خوب غور کیا جیتے
تو میں ایک خشک درخت کے تنے میں تو رہتا۔ دنیا میں جیسے ہی جو مجھ سے بھی
بڑی حالت میں رہیں۔ مجھے یاد آ کر یہ تھی کہ ایک مقرر تھا۔ وہ اکثر کہا کرتی تھی کہ اگر
کو آخر کار ہر بات کی عادت ہو جاتی ہے۔

میری زندگی محسوس سے اسی بعد ذاتی۔ پہلے چند مہینے مزار سنت تھے اور
مجھے انہیں گزرنے میں بڑی ہمت کرنی پڑی۔ خشک صورت کی خواہش تھی مجھے صحت پریشان
کیا۔ یہ قدرتی بات تھی۔ میں جڑا تھا۔ مجھے مادی کا خاص طور پر کبھی خیال نہ آیا۔ میں اپنی
صورت کا آتما تھا۔ کوئی صورت۔ اسی سب باتوں کا نتیجہ میں جاتا تھا۔ سب بات
جس سے مجھے لگتا تھا یاد آتے۔ میری کھڑکی پر ہم کے چہروں سے سمور بڑھتی اور میری

مجھے جا گیا؛

”دو بج کر دی گئی ہیں اور سنگریٹ نوشی پر حال منور ہے۔“

پہلے چند دن تو بڑی سختی سے گزرے۔ شاید یہی وجہ تھی کہ میری طبیعت بہت بھیجی بھیجی رہتی تھی۔ میں نے اپنی چار پائی کے تختہ سے چند کپڑے لٹائیں اور انہیں چرتا رہا۔ دن بھر مجھے تنگی محسوس ہوتی۔ میری سہجہ میں نہ آتا تھا کہ ایک ایسی چیز جس سے کسی کا کچھ خبری ہو نہا جس سے کیوں چھٹی لی گئی ہے۔ بہت دیر بعد مجھے معلوم ہوا کہ یہ بھی سزا کا ایک حصہ ہے لیکن مجھے عادت ہو گئی کہ سنگریٹ کے بغیر ہی کام چلا سکوں اور پھر یہ سب میرے لئے کوئی سزا نہ رہی۔

ان نکلایف کے علاوہ مجھے کوئی پریشانی نہ تھی۔ سب سے اہم مسئلہ وقت گزارنے کا تھا لیکن یہ پریشانی بھی جاتی رہی جب میں نے اپنی یادوں کا سہارا لینا شروع کیا۔ کچھ مرتبہ اپنے گھر کے کمرے کو یاد کرتا اور خیالی سی دنیاں میں ڈال جانے کے لئے ایک کونے سے چلا کرتا اور سست ہی ہر چیز کو ذہنی طور پر گشتا چلا جاتا۔ پہلے پہلے تو یہ سفر ملدی کیٹ جاتا مگر کئی مرتبہ جب میں دوبارہ یہ سفر طے کرتا تو کچھ طریق ہو جاتا۔

اپنے گھر کے کمرے کا سارا فرنیچر میرے ذہن میں تھا۔ کون کیا چیز دوسری ہے ہر چیز کی پوری تفصیل کیا ہے اور تفصیلات بھی اتنی تھیں — یعنی کچھ چیز پر کون سا ڈیزائن ہے۔ کہاں سے لٹائی ہے۔ کون دن یا شگفتہ آیا ہے۔ اس کا رنگ کیسا ہے اس کی اندرونی دھاریاں کیسی ہیں۔ ساتھ ہی ساتھ میری کوشش کرنا کہ یہ فہرست جتنے جوتے میرے خیالات کا اتنا ناز ٹوٹ جاتے اور شاید کا یہ شمار میں تمام جزئیات

جسٹی خواہشات کے محبت پرست سے بھر پور۔ ایک طرح سے میرا ذہنی توازن بڑھ گیا تھا مگر دوسری طرف دفعہ اتنی کامیابی کا سماں مہیا کر گیا۔ آخر کار مجھے حوالدار کی جہد و محنت ملنے ہو گئی۔ دو مکانے کے وقت بارہ بجے خانے کے لڑکوں کے ساتھ آیا کرتا تھا۔ پہلے میں نے اس سے ہی عورتوں کا تذکرہ کیا تھا۔ اُس نے مجھ سے کہا،

”بھئی پہلے پہل اس بات کی شکایت کرتے ہیں۔“

میں بھی اُس کی طرح ہوں اور میں سمجھتا ہوں کہ یہ سنو کہ فیہ مضطرب ہے۔ لیکن! اُس نے کہا کہ اسی لئے تو آپ کو جیل میں ڈال گیا ہے اور کمرے۔

”اُن آزادوں اور بات ہے۔ اب آپ کو آزادی سے محروم کر دیا گیا ہے۔“

میں نے کبھی یوں نہیں سوچا تھا مگر میں نے اُس کے ساتھ اتفاق کیا۔

”یہ جیت ہے۔ میں اُس سے کہا، اور نہ سزا کی ہوئی۔“

”اُن! تم سمجھا رہی آدمی ہوئے اُس نے کہا، بہر حال دوسرے کسی نہ کسی طرح

گزارہ کر ہی جیتے ہیں۔ وہ اپنی دھڑ آپ کرتے ہیں۔“

اور وہ ساتھ ہی مجھے تسلی کے چند لفظ کہہ کے چلا گیا۔ اگلے روز میں نے

دوسروں کی طرح اپنی دھڑ آپ کی۔

اور سنگریٹ بھی ایک انتہائی تھا۔ جب میں جیل میں آیا تو انہوں نے میری بیٹی

نہ تو کون سے تھے نامی اور سب چیزیں جریب میں آسکتی تھیں۔ نہ محلوں پر سنگریٹ جوتے

سے لے لے تھے۔ جو میری مجھے علاوہ کوٹھی میں نے پوچھا:

”کیا یہی چیزیں مجھے واپس دی گئیں ہیں؟“

کے باطل میں رہا ہے۔ ایسا مکمل کر چنہ منتہی کے بعد ہی کئی گھنٹے اس شغل میں گزار دیا اور میرے کہنے پر کئی ایسی چیزیں مانتی جو میرے ذہن نگاہ میں نہ آتی تھیں۔ لیکن تب ہی نے زیادہ برعکس دماغ پر ڈال اتنی زیادہ چیزیں تفصیل سے میرے ذہن میں آئے تھیں اور میرا حلقہ رفتہ رفتہ بڑھتا گیا۔ تب میری سمجھ میں آیا کہ انسان صرف ایک دماغ کی یادیں کے سہارے سو سال قبل میں گزار سکتا ہے۔ اسے یادوں کا دافر ذخیرہ چاہئے تاکہ وہ پریشانی نہ ہو۔ ایک لحاظ سے یہ طاقی خوب تھی۔

اور نیند کا مسئلہ بھی لائق تہوار شرع ضرورت میں رات کو نیند ٹھیک نہیں آتی تھی اور وہی تو باطل ہی نہیں۔ اہمیت آہستہ آہستہ میری تاجی بہتر ہوتی گئی اور دن میں بھی نیند آنے لگی۔ میں کہہ سکتا ہوں کہ آخری مہینوں میں تو سولہ سے اٹھارہ گھنٹے تک روزانہ سوتا تھا۔ باقی رہ گئے چھ گھنٹے سو رہے کھانے پینے وغیرہ بات فطرت و اپنی یادوں کو بیکر سولہ کی کباہی پر مبنی ہو کر رہ جاتے۔

واقعہ یہ ہے کہ میرے گھر سے اور چار پاؤں کے تھنہ کے درمیان مجھے ایک پرانے اندو کا کھڑا لنگی جو تقریباً کچھ سے بچکا ہوا تھا۔ فرسودہ، زرد رنگ اور ایک جھوٹا لاندہ شرع میں ایک فوط کا تھنہ جو جتنی سے پیش ہوا تھا لیکن بعد میں چکر سولہ کی کباہی ضرورت ہو جاتی تھی۔ ایک آدمی اپنے گاؤں سے قسمت آؤڑائی کے لئے باہر نکلا۔ پچیس برس کے بعد وہ دولت مند ہو کر گھر واپس آیا۔ ساتھ بیوی اور ایک بچہ تھا۔ اس کی ماں اس کی بھی کے ساتھ اپنے آبائی گاؤں میں ایک چھوٹا سا بڑی چلتی تھی۔ وہ چلتا تھا کہ اپنی ماں کو بے خبری میں اچانک اسے لہاؤہ اپنی بیوی اور اپنے کو ایک دوسری جگہ چھوڑ آیا۔ جب وہ پریشی میں داخل ہوا تو

اس کی ماں نے اسے نہ پہچانا۔ اس نے مذاق کے طور پر کہا کہ وہ ایک کمرہ مینا چاہتا ہے اور ساتھ ہی اپنی دولت کی نمائش بھی کی۔ رات کو اس کی ماں اور بھی نے اسے فریاد قتل کر دیا اور اس کی لاش دیا ہی ڈالی دی۔ جس پر وہی دماغ پہنچا اور اس نے بغیر جھنڈے کہ وہی کی گزری ہے سافرا کا نام و نشان کیا۔ وہ نے پچاسی سے لے کر ایک سو کویش تک گزرتی۔ میں نے مہینوں میں تب ہی کباہی پر مبنی۔ ایک طرف تو وہ باطل انہو کی بات تھی اور دوسری طرف باطل فطری۔ بہر حال سافرا کی بیوی فطری کو کئی وقعت نہ تھی کیونکہ اسے یہ کبھی کبھی یاد نہ چاہتے تھا۔

میرے سونے کے اوقات، میری ماں کے تھنہ، اخبار کے ترانے کا مطالعہ روشنی اور سامنے کے آواز پر محاذ۔ ان سب کے فضیل میرا وقت کٹ رہا تھا۔ میں نے کبھی پڑھ کر دیکھا تھا کہ میں ہی انسان وقت کی تیر کھو بیٹھتا ہے۔ تجربہ بات مجھے مستحق معلوم نہ ہوتی تھی۔ میری سمجھ میں نہ آتا تھا کہ کس نقطہ پر وہ ایک وقت بڑے اور چھوٹے پر کھتے ہیں۔ وہی گزارنے کو تو بے شک طویل کرتا ہے۔ مگر وقت اندر کے کچھ ای طرح چھوٹی جھلکتا ہے کہ آخر کار بڑے اور چھوٹے دن کی رماہک دوسرے پر گم ہو جاتی ہے اور وہ اپنے نام کو جھٹکتے ہیں۔ صرف آج ایک نصف غلطہ ہوا تھا۔ میرے لئے کچھ معنی نہیں رکھتے۔ جب ایک دن سپاہی نے مجھے کہا کہ میں دن پانچ بیٹھنے سے ہوں۔ تو میں نے اس کا معنی تو کی گھر بات میری سمجھ میں نہ آتی میرے لئے تو ایک ہی مسلسل دن تھا جو میری کوٹھڑی میں چڑھتا دھندلا اور ہر روز میں ایک ہی سا کام کرتا۔ اس دن سپاہی کے چلے جانے کے بعد میں نے کھانے دانے میں کچھ کراں میں پانا چپڑ دیکھا۔ مجھے محسوس ہوا کہ میرا سپرہ سرگرا تھا۔ مگر جیسے میں مسکرنے کی بہت کوشش

کی۔ میں نے ٹیٹ کو مختلف زاویوں سے دیکھا میں اپنے کس کے سامنے بہت پریشان
 تھا۔ میں مسکرا رہا تھا اور وہ بدستور درشت اور مزاح تھا۔ وہ ختم ہو گیا اور ایسی حرکت
 آئی پہنچ جس کا میں مذکرہ نہیں کرنا چاہتا۔ ایسی گھڑی جس کا کوئی نام نہیں ہے۔ ایسا سال
 جہاں شام کا شور غوغا کے جلوس میں جہلی خانہ کی سب منزلوں کو ایک ہی جہت میں ملے
 کر جاتا ہے۔ میں سلاخوں والی گھڑی کے پاس گیا اور مصطفیٰ ہوشی شام کی آخری روشنی میں
 ایک مرتبہ چہرے کے عکس کو خود سے دیکھا۔ وہ ابھی تک سنجیدہ تھا
 اور تعجب یہ ہے کہ اسی لمحہ میں بھی اندر وہ تھا مگر ساتھ ہی کئی مہینوں میں پہلی مرتبہ میں نے
 واضح طور پر اپنی آواز سنی۔ میں نے اسے پہچان لیا کیونکہ وہ ایک مزمز سے میرے کان
 میں گونج رہی تھی اور میں اب سمجھا کر یہ تید کے دور میں اپنے آپ سے ہی باتیں کرتا
 رہا ہوں۔ اب مجھے اس بات کی سنجیدگی جراتی کے دفن کے وہ فرس نے جو کبھی تھی
 نہیں: اس سے تو کوئی مغرب نہیں۔ کئی شخص کے دم دگنا میں بھی نہیں آسکتا کہ زندگی میں
 شام کیوں کر گزشتی ہے۔

4

مجموعی طور پر میں یہ نہیں کہہ سکتا کہ وقت کی رفتار کچھ بہت شست تھی یا بے موسم
 گرد کی آمد تھی اور مجھے اس کا ایک لمحہ بھی نہ ہوا کہ گریس کی ایک پوری رات پہلے ہی گزر
 چکی ہے۔ مجھے یوں محسوس ہوتا تھا کہ جڑیں دی چنے گئیں گے مجھ پر کوئی مذکورہ نئی آفت
 آنے لگی۔ میرا مقدمہ مذکورٹ کی آخری سٹی میں درج ہوا تھا اور میری پیش جوری کے
 جیسے میں ختم ہو رہی تھی جس دن یہ پیش ہوئی کہ ایک کی مصوب پڑی تھی مذکورہ جرح
 شروع ہو چکی تھی اور باہر شروع اپنی پوری آب و تاب سے چمک رہا تھا یہ سہ کیل
 نے مجھے یقینی دلایا کہ ریٹ وٹیں وہی سے زیادہ نہیں چلے گی۔

مہر جانی: "اُمی نے کہا: عدالت کا ردوائی جلدی کرے گی کیونکہ فیصلہ طلب
 مقدموں کی فہرست پر تمہارا مقدمہ سب سے اہم نہیں ہے۔ پھر کشتی کا ایک مقدمہ
 اس کے فوراً بعد پیش ہونے والا ہے اور اسی پر وقت غلاما گئے گا۔"

دو مجھے صبح کے ساڑھے سات بجے اپنے آٹھ حالات کی گواہی مجھے مذکور
 کورٹ میں ملے گئی اور وہ سب ہی مجھے ایک چھوٹے سے کمرہ میں ملے گئے جس میں مذکور
 سا معلوم ہوتا تھا۔ ہم انتظار کرنے لگے۔ تھوڑی دیر بعد ایک دروازہ کھلا اس کے

عقب سے بہت سی آوازیں آ رہی تھیں۔ خرموں کی عقب کی چار کرسیوں کا فرش پر پھنے
کو شرور شغب، ایک ٹھیل، اور ٹھیلوں کی پچی ہوئی گلی جو سے مجھے ضلع کے میبلے یاد آتے
جہاں موسیقی کا پروگرام ہوتا ہے اور پھر ہاں سے تھیں کے لئے کرسیوں وغیرہ ٹھانی جاتی
ہیں۔

سپاہیوں نے مجھے کہا کہ ہمیں عدالت شروع ہونے کا انتظار کرنا ہے۔ اس
میں سے ایک نے مجھے حرکت کی پیش کش کی مگر میں نے جواب دیا کہ۔ اس نے تشریف لے کر
بعد مجھے پوچھا کہ کیا میں گھڑا ہوں۔ میں نے جواب دیا نہیں اور یہ صحیح بھی تھا۔
کیونکہ ایک طرح سے مجھے عدالت کا رونا دیکھنے کا بہت شوق تھا۔ مجھے زندگی بھر
کبھی ایسا موقع نہ ملا تھا۔

”شاید۔“ اور میرے سپاہی نے کہا: ”مگر ایک دو گھنٹے بعد آج تک کمر
چر رہا جاتا ہے اور کتا جاتا ہے۔“

تھوڑی دیر بعد کمر میں پہلی کی ایک غصیل مل گئی تھی۔ انہوں نے میری پیشکش کی گلی
دی۔ ایک دروازہ کھلا اور میں خرموں کے کمر میں داخل ہوا۔ عدالت تماشائیوں سے بھرپور
تھی۔ مگر چکر میں گئی ہوئی تھیں دھوک پھیلے دل سے انداز آ رہی تھی اور اس سے
میرا دم گھٹا ہوا تھا کسی نے تیشے کی کمر میں بند کر رکھی تھیں۔ میں بیٹھ گیا اور پانی
پیرتی کر کے کے دونوں طرف کھڑے ہو گئے۔ اس لمحہ میں نے سامنے چہروں کی ایک
تھار پائی۔ سب میری طرف بڑے غور سے دیکھ رہے تھے۔ میں سمجھا کہ یہ چوڑی
ہے میں انہیں فرد کی حیثیت سے نہیں دیکھ رہا تھا۔ مجھے تو وہ سب ایک جیسے دکھائی
دیتے تھے۔ میرا تڑپنے والوں تھا جیسے کہ ٹرام میں کسی سوار کی کا اُسے سامنے بیٹھے

ہوئے لوگوں کا احساس ہوتا ہے۔ جہاں سارے جگہ نام مسافر پر نوہار کو کاڑھے
ہیں اور اسے بہت مضحکہ خیز پاتے ہیں۔ مجھے خوب علم تھا کہ یہ راہیات خجالی ہے۔
کیونکہ یہاں تو سفر نہیں مگر مجرم کے انداز کی حد تا حد تھی تاہم دونوں میں فرق زیادہ نہیں ہے۔
پیرمائی یہی خیالی تھا جو مجھے سوجھا۔

بناکرو میں ایک خاص مجمع تھا۔ میرا سر جکڑا لے گیا۔ میں نے عدالت کھڑا ہی
تھوڑی دیر گزر گئی مجھے کوئی جانا پہچاننا چہرہ دکھائی نہ دیا۔ مجھے پہلے تو قیچہ نہ آیا کہ یہ ساری
خلقت صرف مجھے دیکھنے کے لئے جمع ہوئی ہے۔ عام طور پر تو لوگوں نے کبھی میری
طرف تو جہ نہیں دی۔ مجھے یہ سمجھنے میں بڑی دقت محسوس ہوئی کہ کیا یہ ساری پہل پہل
میری ہی خاطر ہے۔ لوگوں کی دیکھی کا یوں مرکز بننا میرے لئے ایک نیا تجربہ تھا۔ میں
نے اپنے بائیں طرف کے سپاہی کو کہا:

”مجھے جمع ہے؟“

”اُس نے جواب دیا:

”ہاں! یہ اخباروں کی وجہ سے ہے۔“

اور اُس نے ایک گروہ کی طرف اشارہ کیا جو جمی رہی کے پیچھے ایک میز کے
قریب بیٹھا تھا اُس نے مجھے کہا:

”وہ وہاں دیکھئے!“

میں نے پچھا: ”کیوں؟“

اور اُس نے دہرایا: ”خبر نویس!“

وہاں اخبار نویسوں میں سے ایک کو پہچاننا تھا۔ اسی اخبار نویس نے اُسے

دیکھا اور ہماری طرف بڑھنا شروع کیا۔ وہ ایک عمر آدمی تھا، ہمدرد قسم کا۔ اسی کے چہرے پر ایک کھسیانی کی جھنجھکی تھی۔ اُس نے سیاہی سے گرم جوشی کے ساتھ اٹھوایا میں نے دیکھا کہ عدالت کے کمرے میں سب لوگ ایک دوسرے سے لیکن رہے ہیں دو مختلف ٹویموں میں گپ شپ کر رہے تھے۔ یوں معلوم ہوتا تھا جیسے کہ ایک فٹ میں سب لوگ خوش باش ہیں اور اپنی قسم کے لوگوں سے قطعاً باطبیع ہو رہے ہیں۔ مجھے یوں محسوس ہوا کہ میں یہاں ایک انفرادہ مہمان ہوں جو واقعی مصلحت ہونے کی بجائے دخل و مصلحتوں سے آزاد ہے۔ اسی اثنا میں اخبار نویس نے مسکراتے ہوئے مجھ سے خطاب کیا۔ اُنہی نے امید ظاہر کی کہ میرا انجام بخیر ہوگا۔ میں نے اُس کا شکریہ ادا کیا۔ اُنہی نے مزید کہا:

”آپ کو معلوم ہے ہم نے آپ کے مقدمہ کو ڈاڈر چارٹر صا کر بیان کیا ہے۔ اگرچہ کامرسم اخباروں کے لئے منظر ہوتا ہے کیونکہ کہنے کو بہت کم مواد ملتا ہے۔ ورنہ آپ کی کہانی اور اسی کے مجرم کی داستان جو آپ کے بعد آنے والا ہے، کچھ زیادہ اہم اور دلچسپ نہیں ہیں۔ آپ نے اُس کے متعلق اتنا ہی ہوگا، ایک پندرہ گن کا مقدمہ ہے۔“

پھر تو رہی اُنہی نے ایک آدمی کی طرف اشارہ کیا، جو اخبار نویسوں کے گروہ میں تھا اور اٹھ کر جا رہا تھا۔ یہ ایک منفی سا آدمی تھا جس کی شکل ایک ہلکے نیلے سے متعلق تھی۔ اُنہی نے سیاہ عینوں کی ایک بڑی سی عینک پہن رکھی تھی۔ اُنہی نے مجھے بتایا کہ وہ چیرس کے ایک اخبار کا خصوصی نمائندہ ہے۔

”مگر وہ آپ کی خاطر نہیں آیا۔ چونکہ اُس کو دوسرے مجرم کی کارروائی اپنے

— اخبار کو جھیننا تھی لہذا آئندہ نے کہا کہ گئے اُنہوں آپ کے مقدمے کی رپورٹ لکھنا سے بھیج دے۔“

میں کہنے ہی والا تھا کہ یہ تو اُس کی بڑی مہربانی ہے۔ مگر میں نے سر ہاکی یہ تو فضول اور بے بات ہے۔ اُنہی نے اٹھ کر مجھے ایک دستاویز اشارہ کیا اور رحمت ہوا۔ ہم پھر چارٹر منسٹر انتظار کرتے رہے۔ اب کچھ ساتویں کے ہوا میرا دیکل آن پہنچا۔ وہ یہی جہاں میں تھا اور اُس کے ارد گرد بہت سے دوسرے لوگ گنگو کر رہے تھے۔ وہ اخبار نویسوں کے میز کی طرف بڑھا اور اُن سے اٹھوایا۔ اُنہی نے کچھ مذاق کیا اور منہا سب لوگ جیسے آرام اور سکون میں معلوم ہوتے تھے جتنی کہ مجرم کی نشست کا دور گھنٹی بھی۔ سب لوگ اپنی اپنی جگہ پر بیٹھ گئے۔ میرا دیکل میری طرف آیا۔ مجھ سے اٹھوایا اور مجھے مشورہ دیا کہ جب وہ مجھ سے سوال کرے تو میں مختصر طور پر لکھی جا جواب دوں اور اپنے طور پر ہرگز کوئی بیان شروع نہ کر دوں اور باقی سب معاملہ اسی پر چھوڑ دوں۔

میں نے اپنی بائیں طرف ایک کرسی کے ہٹنے کی آواز سنی۔ میں نے ایک بزرگ کو اٹھایا دیکھا۔ وہ سرخ لباس میں بیٹھ رہا تھا۔ عینک لگا تھے جس سے وہ اپنا ہاں پھٹتا ہوا بیٹھ گیا۔ یہ سرکاری دیکل تھا۔ ایک نقیب نے مجرم جہاں کی آواز اٹھائی کہ اسی وقت جہت میں گئے ہوئے وہاں سے بڑے ہلکے سے حرکت میں آگئے۔ تین چار بغل میں دستاویزات وہاں سے ہوتے داخل ہوئے۔ وہ سیاہ لباس میں تھے اور تیرہ گزیش میں۔ وہ تیرہ گزیشی سے اپنی نشستوں کی طرف جہاں میں ایک دستاویز ملے مقام پر بیٹھیں۔ بڑھے۔ جہاں میں سرخ لباس میں تھا وہ درمیان والی اونچے کرسی پر بیٹھ گیا اور بائیں

قوی آثار کے سامنے میز پر رکھ دی۔ وہاں کے ساتھ اپنی کھڑی پر بھیجی اور اعلیٰ کی کہ عداوت کی کاروائی شروع ہوتی ہے۔

اختیار نویں پہلے ہی ہاتھ میں تم سے ہوتے تھے۔ ان کا انداز کچھ ایسا تھا کہ انہیں کسی شے میں کوئی خاص دلچسپی نہیں ہے۔ وہ بڑے چالاک اور عیار نظر آتے تھے ان میں سے ایک تو بہت کم عمر تھا۔ اس کا لباس بھروسے نوکستری جیک کا تھا اور گھٹائی نیلی۔ وہ اپنے سامنے علم دھرسے بیٹھا تھا اور انگلی بازو کر مجھے دیکھ رہا تھا۔ ان کا چہرہ کچھ موزوں اور مناسب نہ تھا۔ میری توجہ کا مرکز اس کی دو انگلیوں تھیں۔ ہر دو رنگ اور روشنی جو بڑے خود سے یہ رہا بڑا ملے رہی تھیں مگر یہ تاثر دینے لیتے کہ وہ کسی متوجہ پہنچیں ہیں۔ مجھے عجیب سا معلوم ہوا کہ اگر میں اپنا تجزیہ آپ ہی کر لیا ہوں۔ شاید اس کی وجہ یہ بھی تھی کہ میں عداوت کے آداب در رسوم سے بے بہرہ تھا۔ اسی لئے کاروائی کے سبب یہ میری سمجھ میں نہیں آ رہے تھے۔ میری کے انتخاب کا طریقہ بدستور کی۔ میرے ذہن، سرکاری دیکل اور جبری دوسروں کی وجہ سے ہر تازہ جب وہ سوال کرتا مادی جبری کے نزدیک عداوت کی طرف مڑ جاتا۔ خود غریب کا جلدی۔ سے چڑھا جانا اس میں مجھے چند گھنوں اور گھنوں کے نام ناخوشی محسوس ہوتے اور پھر میرے ذہن سے نصیر کے طور پر کچھ سوال کئے گئے۔ اس کے بعد صدر نے اعلیٰ کی کہ اب اگر ہوں کی خبریت پڑھیں جائے گی۔ نقیب نے نام پڑے اور میری توجہ اس کی طرف مبذول ہو گئی۔ کچھ نام کی کہ تو میں میراں ہوا۔ جو نبی اعلیٰ ختم ہوا میں نے دیکھا کہ گواہ ایک ایک کر کے ملے اور پھر فوجی بازو کے دروازے سے غائب ہو گئے۔ ہسپتال کا ڈاکٹر کٹر، جو کھڑا ہوا تھا اس پر پریز، دیوبند، سیسی، صفائی، ماری۔ افراد کو کہنے مجھے جکھا رہا تھا

اشارہ کیا۔ میں میراں تھا کہ میں نے اس سے پہلے نہیں کیوں نہیں دیکھا۔ جو نبی اس کا نام پکڑا گیا۔ آخری گواہ سیسٹا اظہر ہوا۔ اس کے پہلو میں جسے رستوران والی خاتون کو پہچانا۔ وہ مردوں جیسا کوٹ پہنتے ہوئے تھی اور اس کا انداز وہی فیصلہ کن اور دلک اور باطنی تھا۔ انہی نے مجھے فور سے دیکھا مگر مجھے فور ذکر کی فرست کہاں تھی۔ صدر نے پھر تقریر شروع کر دی۔ انہی نے کہا کہ بحث طلب امور باب جرح شروع ہو رہی ہے اور اُسے جبک سے یہ رفتار شروع کرنا غیر درجی محسوس ہوتا ہے کہ وہ خاموشی اور کھینچ رہی۔ اس کے کہنے کے مطابق انہی کی یہ خود ماری ہے کہ وہ نہایت غیر جانب داری سے عداوت کا فرضیہ ادا کرے تاکہ مقدمے کے سبب پہنچوں۔ پر واقعی انداز میں عداوت کی جا سکے۔ جبری کی جرم ساز تہیز کر کے گی وہ عدل اور انصاف پر مبنی ہو۔ اور ہر حال وہ معمولی سی سمجھتی ہوئے کی صورت میں مادی عداوت کو خافی کر دے گا۔

گرمی جبری ہی تھی اور میں نے دیکھا کہ کچھ لوگ اخباروں سے ہوا کر رہے تھے۔ اسی وجہ سے شکیں دار کا انداز کی ایک جی سی مسلسل سرسراہٹ جاری رہی۔ صدر نے نقیب کو اشارہ کیا۔ اس نے اشارہ پائے ہی ادا کر کے پھینکیاں لے سائے کہیں جرمینوں جنوں نے فوراً استعمال کرنا شروع کر دیں۔

اب میری دلچسپی شروع ہوئی۔ صدر نے جبکہ ایک ہر سکون بکھر گیا۔ ہر بی سوال کئے۔ پہلے تو ایک متر متر پھر مجھ سے میرے نام نشان کا اعلان کر دیا گیا۔ پھر اس کی ہیکواری میں شک اپکا تھا لیکن میں نے سوچا کہ درحقیقت نظری امر کیونکہ ہر ملتا ہے کہ غلطی میں کہیں ایک کی بجائے دوسرے کو مڑا جائے۔ پھر صدر نے

فرہیزم پر حسنا شروع کی۔ وہ مجھے خطاب کرتے ہوئے ہر دفعہ صرف یہی لفظ کہتا:
"بھئی ہے؟"

میں ہر مرتبہ اپنے کوکل کی پادشہ کے مطابق جواب دیتا رہا:
"جی ہاں صاحب صدر؟"

اس کی تقریر ایسی پرگنہ کی کہ وہ معمولی کی معمولی تفصیل بھی بیان کر رہا تھا۔ اس
دوران میں اخبار نویس تیزی سے لکھتے رہے۔ ان میں جو سب سے کم عمر تھیں نے سنا
کہ ان کی نگاہیں پھر پرچی ہوتی ہیں۔ اس عجیب کی منفی صورت کی کبھی خوشی کی طرح متنی
گرجو رو کی تشریح صرف لباس دانے کی پڑھتی تھیں۔

مجھے ٹرام کے مسافروں کا خیال آیا۔ ٹھوڑی دیر کے بعد مجھ نے کئی کئی
کی۔ اپنی نالی کے درق اٹھائے اور اپنے آپ کو چمکا کرتے ہوئے مجھے تنبیہ کی
سے خطاب کیا۔

صدر نے کہا کہ مزدوری ہے کہ وہ اب مجھ سے کچھ ایسے سوالات کرے
جو بظاہر میرے مقدمے سے غیر متعلق معلوم ہوتے ہیں لیکن دراصل ان کا معاملہ ہے
رابطہ ہے۔ میرا تھا شکار اب پھر وہ اتنی کے متعلق بات کرنے والا ہے اور ساتھ
یہ مجھے یہ احساسی ہوا کہ یہ امر میرے لئے کئی قدر پریشانی کا باعث ہے۔ اس نے
مجھ سے پوچھا کہ میں نے ان کی بارگاہوں کی رائے میں کیوں ڈال رکھا تھا؟

میں نے جواب دیا:
"دراصل ہے۔ مگر میں ان کی دیکھ بھال کرنے کے لئے میرے پاس کافی

رقم نہیں تھی۔"

پھر ان نے مجھ سے پوچھا:

ان کی طبیعت پر مجھے کچھ تکلیف نہ ہوتی؟

میں نے جواب دیا:

"خانی نہیں، ایک اور سہ کے دست نگہ کرتے اور نہ ہی کسی اور کے متعلق۔ ہنر
ہم دونوں اپنے ہی زندگی کے سہ پر ماری ہو گئے تھے۔"

صدر نے پھر کہا کہ وہ اس مقدمہ پر زیادہ اصرار نہیں کرے گا اور سرکاری دیکھ
دریافت کیا کہ اسے مجھ سے اس سہ پر کچھ اور سوال تو نہیں کرنا ہے۔

آخر ان کے لئے کہ ہوئی اور میری طرف نگاہ کئے بغیر کہا کہ وہ صاحب صدر کی
اجازت سے یہ پڑھنا چاہے گا کہ میں نے ان کی طرف کیا اس نیت سے کیا تھا کہ وہ
ایک عرب کو تھک دوں۔

میں نے کہا - نہیں؟

"پھر آپ صبر کریں گے اور میں بھی اسی مقدمہ پر جوتے؟"

میں نے کہا:

"بھئی اتنی بات تھی؟"

سرکاری دیکھ نے ایک ناخوشگوار بیجے میں کہا:

"فی الحال یہ کافی ہے۔"

اس کے بعد سب کو کچھ الجھن سی ہوتی۔ کم از کم میں ضرور پریشان تھا۔ لیکن کے
ساتھ ملازم مشورہ کے بعد صدر سے دعا کی کہ عدالت اب برخواست ہوتی ہے اور گرا
کی شہادتیں دوپہر کے بعد ہوں گی۔

اپنی انکھیں جھکائیں اور دو ہمبر اپنے جوتوں کی نوک کی طرف دیکھا۔ اصرار کیا کہ کیا کہیں وہ
کی لاش کو بائیں دیکھنا نہیں چاہتا تھا اور میرا ایک انصرم بھی نہیں پکا اور میں جنازہ کے فوراً
پہ بعد قبر پر فائز چڑھے فائز خدمت ہو گیا۔ ایک اور چیز سے اُس نے اپنے ہاتھ بچا۔ جنازہ کی
بروم ادا کرنے والے ایک عازم نے اُسے بتایا تھا کہ مجھے اتنی کی طرف سے معلوم ہوتی ہے ایک
شوک کے لئے سکتے چڑھیں۔ صدر نے اُس سے پوچھا:

”یہی تم کبڑے ہی فرم کے بارے میں بتا دے۔ رجب مرے“
ڈاکٹر کیشش دہتے ہیں چڑھ گیا۔ مجھے نہ صحت کرتے ہوئے کہا:
”یہ تانواں ہے۔ میرا فرزند نصیب ہے کہ یہ سوال پوچھوں۔“

پھر صدر نے سرکاری دکان سے کہا کہ کیا وہ گواہ سے کوئی سوال پوچھتا ہے۔
اور سرکاری دکان جبکہ اٹھا:
”یہی تم کبڑے ہی فرم کے بارے میں بتا دے۔ رجب مرے“

اُس نے یہ کہتے ہوئے میری طرف ایک ایسی ہی تانواں نظر ڈالی کہ برسوں کے بعد
پہلی دفعہ میری ہانک پکڑ کر رو پڑوں۔ کیونکہ مجھے احساس ہوا کہ مجھ سے کہیں کو
سب لوگ نفرت کرتے ہیں۔

صدر نے جبری اور میرے دکان سے پوچھا کہ انہیں کوئی اور سوال کرنا چاہیے؟
پھر اُس نے چوکیار کا بیان مشا شروع کیا۔ اُس کی باری بھی، مگر کہہ جوں کی طرف
سب رومات ادا ہوئی۔ کچھ سے یہ داخل ہوتے چوکیار نے میری طرف ایک نگاہ ڈالی اور
پھر اُس نے نظریہ پھیریں۔ اُس نے سوالوں کے جواب دیتے۔ اُس نے کہا میں نے اتنی
کی لاش کو دیکھنے سے انکار کر دیا تھا۔ یہ انگلیٹ جیتے پتے ہو گیا تھا۔ نیز کہ میں نے

مجھے سوچنے کی مہلت نہ تھی۔ اسی سے پہلے کہ مجھے معلوم ہو کہ کیا ہو رہا ہے
انہوں نے مجھے وہاں سے نکالا۔ حرا لک کی کمر ٹی میں سوار کیا اور میں سے گئے۔ وہاں
میں نے دو ہمبر کاٹن کیا۔ تھوڑی ہی دور بعد کہ میں مجھے پھر پہنچے آ گیا۔ جس اتنی ہی مہلت
کی کہ میں کہہ سکوں کہ میں بہت تھکا ہوا ہوں۔ اب میں پھر عدالت کے اسی کمرے میں تھا اور
میرے سامنے پھر ہی چہرے تھے۔ صرف گرمی زیادہ ہو گئی تھی۔ کسی کلامت سے اب
ہر ایک شخص کے پاس کچھ بھان جیس۔ جیرو کے پاس، سرکاری دکان، میرا پناہ دکان اور اخبار
فرمیں بھی کے ہاتھ میں کھینچے تھے۔ کم عمر اخبار نویس اور منشی کی شیشی قانون انجلی ایک
دہی تھے۔ مگر وہ کچھ نہیں کر رہے تھے اور دستور مجھے خاموشی سے دیکھ رہے تھے۔
میں نے اپنے چہرہ سے سینہ پوچھا۔ مجھے ابھی زاپنی ہوش آئی تھی اور زانی
جگہ کی چوٹی میں تھا کہ نصیب نے مسیتاں کے ڈاکٹر کیڑا پکارا۔ اس سے سوال کیا گیا کہ کیا
اتنی اکثر مجھ سے شکوہ شکایت دہتے ہیں تھی۔ اُس نے کہا:

”اے! لیکن یہ تو سب ناشی خواروں کی عادت ہے کہ وہ اپنے اقربہ و اقارب
کی شکایت کرتے رہتے ہیں۔“

صدر نے اُسے کہا کہ وہ واضح طور پر بتائے کہ کیا اتنی مجھ پر بہت صحتی نہیں کہ
میں نے انہیں رزمیوں کے ہسپتال میں رکھ کر پھینکا ہے۔
”اور میرے چہرے پر اب دیا۔“ اُس نے۔

گرمی اتنی کہ مزید کچھ اضافہ نہ کیا۔ ایک اور سوال کا جواب دیتے ہوئے
اُس نے کہا کہ جنازہ کے دن مجھے اس قدر ٹھنڈا اور پرسکون دیکھ کر اُسے اپنے ہاتھ
ہوا۔ لیکن نے اُس سے پوچھا کہ اُس نے کوئی کمرہ دیکھ کر کیا کہیں سرد ہر تھا۔ ڈاکٹر کیشش نے

دودھ حریمیت کافی ہی مختص۔ مجھے محسوس ہوا کہ ساری حالت میں نفرت کی ایک لہر دوڑ گئی تھی۔ اور یہ اپنی مزہ سنبھال کر میں واقعی غم میں تھی۔ چونکہ وہ کو کہا گیا کہ وہ دودھ والی کافی اور سنگریٹ نوشی کا قصد دہرائے۔ سرکاری دیکھنے میں صرف لڑنے کی تواریف کی انھوں میں طنز کی ایک جھلک تھی۔ اس لمحہ میرے دیکھنے پر کیا لڑے۔ پرچہ کیا اُس نے میرے ساتھ سنگریٹ نہیں پیا تھا مگر اس سوال پر سرکاری دیکھنے تندی سے اصرار کرتا ہوا اور شدت کے ساتھ سوال کی مخالفت کی۔ میں نے کہا:

”یاد رکھیں کہ میں نے دودھ کی کاربے استعمال کئے ہاں ہے جسے استعمال کے گروہوں کے خلاف؟ یا یہ ایسے ذہان شکن ہیں کہ ان میں شہ پرانے کی کوشش بالکل بے اثر ہے۔“

اس اعتراض کے باوجود صدر نے چونکہ اسے تعاد کیا کہ وہ سوال کا جواب دے گا۔ بڑے بارگھن سا گیا اور اُس نے کہا:

”مجھے خوب معلوم ہے کہ غلطی میری ہے لیکن جب صاحب نے مجھے سنگریٹ پہننے کی قویں انگار کے لئے کی جڑت نہ کر سکا۔“

آخری بار مجھ سے پوچھا گیا کہ مجھے کچھ اور کہنا ہے؟

”جی نہیں۔“ میں نے جواب دیا، صرف یہی کہ گواہ چھپا کر کہتا ہے۔ یہ سچ ہے کہ میں نے اس کو سنگریٹ پہننے کا تھا۔

چونکہ اُس نے مجھے ایک گز تعجب اور شکر سے دیکھا۔ وہ عجیب اور پھر اُس نے کہا کہ دودھ والی کافی اُس نے مجھے چینی کی تھی۔ میرے دیکھنے سے فوج کے نشتر میں آسمان پر اٹھ گیا اور ہواؤں میں اٹھ گیا کہ اُسے امید ہے کہ میری اسی بات کی اہمیت کی

داد دے گی۔ لیکن سرکاری دیکھنے ایک گریڈ دار آواز میں چپکا:

”جی ہاں، مجھے یہ ضرور اس کی اہمیت پہنچانے کی۔ وہ اس نتیجے پہنچنے کی کہ ایک انجینیئر غلطی سے کافی چینی کو کھاتا تھا لیکن ایک پیشہ کو ایسی جہت کی لاش کے سامنے ہے اُس نے جنم دیا تھا، اتنی تو فوج نہ ہوتی کہ اس چینی کو کھاتا تھا۔“

چونکہ اُس نے اپنی جگہ پر کھڑے کیا۔

جب ماس پر زکی باری آئی تو ایک نصیب کو اُسے سہارا دے کر کھڑے ہو گیا۔ پھر پڑنے لگا کہ اگرچہ وہ میری والدہ کو خوب جانتا تھا، اُس نے مجھے صرف ایک دندہ دیکھا تھا۔ جنازے کے دن۔ اس سے پوچھا گیا کہ میرا ملوک اُس دن کیا تھا، اُس نے جواب دیا:

”آپ جانتے ہیں کہ میں غور میں بہت جلتا تھا۔ ہڈیاں میں نے کچھ نہیں دیکھا۔ میرا فم شامہ میں ملازم ہوا تھا۔ یہ ایک بہت بڑا مصروف تھا۔ میرے عزیز دوست کی موت اور اسی جنازے کے دوران میں بے چارہ ہو گیا تھا۔ ہڈیاں میں صحت کی طرف کئی توجہ نہ دے سکا۔“

سرکاری دیکھنے نے اُسے کہا کہ کم از کم اُس نے مجھ کو دیکھا، چوہا جب پڑنے لگا تو کہیں۔ سرکاری دیکھنے نے اپنی طرف سے زور سے کہا:

”میرے چیری اسی بیان پر مناسب توجہ کرے گی۔“

مگر میرا دیکھنے اس پر برہم ہو گیا، اُس نے پڑنے دیکھے نہیں جو مجھے تشدد و مزاحمت ہوتا تھا، چھپا کر دیکھا وہ حقیقت بیان دے سکتا ہے کہ میں نے ایک ایسی آنسو نہیں بہا، پھر پڑنے جواب دیا۔ نہیں؟

اس پر کچھ لوگ نہیں پڑے اور میرے دیکھنے سے ایک آستین پر چھانستے ہوئے ٹھکانا
 پیسے لے گیا تھا۔
 "اس کا ردائی کی عجیب صورت ہے۔ سب کچھ جانتا ہے اور کچھ بھی نہیں جانتا۔
 صحیح واقعات معلوم کرنے کی کوشش ہی نہیں کی جا رہی ہے۔
 سرکاری دیکھنے کو تو جرنل کی۔ وہ مندرجہ بالا اور شیل افشا کر اپنے
 کاغذات پر کچھ لکھنے لگا۔ بالکل بے نیاز۔"

پانچ منٹ کے اندھا کے بعد جس کے دوران جرنل میرے دیکھنے سے مجھ سے کہا کہ
 سب کا ردائی میرے موافق چم رہی ہے۔ سلیٹ کی آواز کان میں چڑی۔ وہ مدعا علیہ کی
 طرف سے گراہی دے رہا تھا اور مدعا علیہ میں تھا۔ وہی وقت سلیٹ میری طرف نکلا۔
 ڈانٹا۔ گراہی دیتے ہوئے وہ ہاتھوں میں اپنی ٹوپی کو پھینچ رہا تھا۔ وہ اپنا سب سے
 اچھا سوٹ پہنے ہوئے تھا جو وہ کبھی کسی انوار کے دل میں ہم آئینے گھوڑ دوڑ جایا کرتے
 تھے پہنا کرتا تھا۔ مگر ظاہر ہے کہ وہ اپنا کارڈنگ سٹاک کیونکہ قیصل کا لگا بنا کرنے کے
 لئے اس نے صرف تانبے کا ایک ٹیٹو لکھا تھا۔ اس سے پوچھا گیا کہ کیا میں اس کا
 لگا کہہ سکتا ہوں؟

اس نے کہا:
 "جی ہاں! لیکن ایک دوست بھی۔"

یوں وہ میرے متعلق سوچتا تھا اور اس نے جرح کے دوران کہا کہ میں ایک شریف
 شخص ہوں۔ یہی میری شہرت ہے۔ جب اس سے پوچھا گیا کہ اس کے کیا معنی ہیں تو
 اس نے کہا کہ ساری دنیا اس کا مطلب سمجھتی ہے۔ اس نے یہ بھی بیان دیا کہ یہ ایک

خاص طبع و کم گو آدمی ہوں اور صرف یہ جانتا ہے کہ میں بڑھ گئی نہیں کرتا۔ سرکاری
 دیکھنے اس سے پوچھا کہ کیا میں باقاعدگی سے جی او اکر تھیں ہوں سلیٹ ہنسنا اور اس نے
 کہا:

"جی ہاں! مگر یہ حوالہ تفصیلات کا ہے۔ ہم دونوں کے درمیان حساب و کتاب نہ
 دل۔"

اس سے پھر پوچھا گیا کہ میرے جرم کے بارے میں اس کی کیا رائے ہے۔ اس
 نے آہستہ سے ہاتھ کھڑے پر رکھے۔ صاف معلوم ہو رہا تھا کہ اب وہ کچھ کہنے کی تیاری
 کر رہا ہے۔ اس نے کہا:

"میری رائے میں یہ محض ایک حادثہ ہے۔ ایک بد بختی جو ساری دنیا جانتی ہے کہ
 کیا ہے۔ انسان کو اس سے بچاؤ کی کوئی تیرتی نہیں سمجھتی۔ جی ہاں۔ میری نظریں
 یہ ایک بد بختی ہے۔"

وہ تقریر جاری رکھنے والا تھا مگر صدر نے اسے ٹوک دیا اور اس کا ٹھکر۔ اور
 کرتے ہوئے کہا کہ یہ ٹھیک ہے۔ پھر سلیٹ گھبراہٹ میں کچھ دیر بیٹھ گیا۔ اس نے
 کہا کہ اس کا بیان تمام نہیں ہوا۔ وہ مزید کچھ کہنا چاہتا ہے۔ اس سے تھا خدایا کیا کہ وہ
 اپنا بیان ختم کرے۔ اس نے ٹھکر سے کہا کہ جو محض ایک حادثہ ہے اور صدر نے اس سے
 کہا:

"جی ہاں! یہ تو ہے کہ میرے بیان اس سے ہیں کہ اس قسم کے حادثے کا قانون کے
 مطابق فیصلہ کریں۔ ہم آپ کا ٹھکر۔ اور اگر تھیں ہیں۔ آپ تشریف لے جا سکتے ہیں؟"

جب سلیٹ اپنے علم افضل اور ذہن فوجی کا اظہار کر چکا تو میری طرف ٹھکر دیا

خدا تعالیٰ ہو گیا، مگر وہ مجبور ہے کہ عام آداب شائستگی کو بالواسطہ مل کر اپنا فرض انجام دے۔ اُس نے پھر ماری سے تعارف کیا کہ وہ اسی دہ کی پوری تفصیل بیان کرے جب پہلی بار ہماری جنسی ملاقات ہوئی تھی۔ ماری اولیٰ تو کچھ کہنا نہیں جانتی تھی مگر سرکاری دکان کے اصرار پر اُس نے ہمارے باہم بڑے لاتعداد کیا۔ اُس کے بعد ہمارا ایک ساتھ سینا جانا اور ہمارا اکٹھا میرے پاس ٹھنا۔ سرکاری دکان نے ماری کے بیان کے فوائد کہا کہ وہ اسی تعداد تک کے پروگرام کو تفصیل باز نہ لینا چاہتا ہے۔ اُس نے کہا:

”ماری نے ماتحت ملاقات میں بتایا ہے کہ وہ کس قسم کی فلم دیکھنے گئے تھے؟
اُس نے خامی کو ری آواز میں کہا:
”واقعہ یہ ہے کہ وہ فلم فرانڈل کی تھی جو ایک مذاقہ بیرو ہے۔“

جب اُس نے بات ختم کی تو ملاقات میں مکمل خاموشی چھا گئی۔ پھر سرکاری دکان کی بڑی مسند پر گئی۔ اٹھا اور میری طرف اشارہ کرتے ہوئے نہایت جذباتی انداز میں آہستہ سے کہنے لگا:

”صاحبانِ بھری! خود فرما دیجئے! اپنی لاکھ موت کے دوسرے ہی دن پر کوئی کام ہی جاتا ہے۔ ایک فرانڈل کی مسند تھیں لاکھ لاکھ کرتا ہے اور ایک مذاقہ فلم میں ہمارے لطافت انداز ہوتا ہے۔ یہ آپ کو اس سے زیادہ کچھ نہیں کہنا چاہتا۔“

وہ بیڑہ گیا اور خاموشی مسلسل چھاتی رہی۔ مگر ایک ایسا ماری پھوٹ چڑی اور اُس نے سکسکون لینا شروع کر دی۔ اُس نے کہا کہ حقیقت یہی ہے کہ سچائی کچھ اور چارہ اس کو مجبور کیا گیا ہے کہ وہ اپنی مرضی کے خلاف بیان دے۔ اُس کا یہ مطلب ہرگز نہیں تھا۔ وہ مجھے خوب جانتی ہے اور اُسے یقین ہے کہ میں نے کوئی خواب کام نہیں کیا۔

معلوم ہوتا تھا کہ اُس کی انکسیر مربوط ہی اور اُس کے ہونٹ کا ٹپ رہے ہیں۔ وہ زبانی حال سے مجبور ہے پھر اندر اٹھا کہ کیا وہ میرے لئے کچھ اندر بھی کر سکتا ہے میں نے کچھ نہ کہا نہ ہی ملے کوئی اشارہ کیا مگر زندگی میں پہلی مرتبہ میرا جی جا اکر ایک مرد کا منہ چوم واپس دھونے اُس نے میرے کہا کہ وہ کمرے سے سے چلا جائے۔ سیٹلے نیچے اتر کر اپنی جگہ پر بیٹھ گئی۔ باقی ساعت کے دوران وہ وہیں بیٹھا کارروائی مستردار سامنے کی طرف جھکے ہوئے کہیں انکسیروں پر دھرے اور اپنی ٹوپی ہاتھوں میں لئے، اُس نے ہر لفظ کو حذر سے سنا۔ اب ماری داخل ہوئی۔ اُس کے سر پر سیٹ تھا اور وہ اب بھی جیسے معلوم ہو رہی تھی۔ اگرچہ وہ مجھے کھلے بالوں میں زیادہ مکی معلوم ہوتی تھی جس جگہ میں تھا وہاں میں اُس کی جھانکوں کا جھکا جھکا پھر ہنسوں کر دھاتھا اور میں دیکھ رہا تھا کہ اُس کا کپڑا ہونٹ ساوا دقت کچھ لٹکا ہوا سا ہے۔ وہ بہت گھبرائی ہوئی معلوم ہوتی تھی۔ چھوٹے پی اُس سے پوچھا گیا کہ کد کب سے مجھے جانتی ہے۔ اُس نے اُسے اُنے کا ذکر کیا جب وہ ہمارے ساتھ دفتر میں کام کیا کرتی تھی۔ بعد اُنے اُس سے پوچھا کہ میرے ساتھ اُس کے کیا تعلقات تھے اُس نے کہا کہ وہ میری ایک دوست ہے۔ ایک اور سوال کا جواب دیتے ہوئے اُس نے کہا کہ یہ صحیح ہے کہ وہ مجھ سے شادی کرنے والی تھی۔

سرکاری دکان نے جو اپنی فانی کی درنی گردانی کر رہا تھا اس سے یکایک پوچھا کہ ہمارے جنسی تعلقات کس دن سے شروع ہوئے۔ اُس نے تاریخ بتائی۔ سرکاری دکان نے جڑی لا پورانی کے انداز میں کہا کہ اُس کا خیال ہے کہ یہ تاریخ واقعی کے جنازے کے دوسرے دن کی تھی۔ پھر اُس نے کچھ طنز کیا کہ وہ ایک ایسے ٹارگت معاملہ کے متعلق تھا؟ اور اُس میں کسے گا۔ وہ ماری کے ساتھ اُدس دیش کو خوب سمجھتا ہے اور یہاں اُس کا بھر

یہی سہارے پر تکیہ اُسے لے گیا اور عزائم کی کارروائی جاری رہی۔

یہ منظر اجماعِ ختم نہ ہونے پایا تھا کہ میں نے اطلاع کیا کہ میں ایک دینا متدار آدمی ہوں۔ اُنہی نے یہ بھی کہا کہ میں ایک بھادو آدمی ہوں مگر کسی نے اُن کی ایک بات نہ سنی۔ یہ بات بھی ختم نہ ہوئی تھی کہ سلفا کو یہ کہتے ہوئے سنایا کہ اُسے یاد ہے کہ میں نے اُن کے کتے کے ساتھ ہمیشہ نیکی سلوک کیا تھا۔ جب اُس سے میرے اور اُن کے متعلق سوال کیا گیا تو اُس نے کہا کہ میں درحقیقت اپنی جان سے کم ہی بات کیا کرتا تھا اور یہی وجہ ہے کہ میں نے اُن کو ہڑتوں کی رانٹیں گاہیں چھوڑ رکھا تھا۔ سلفا نے کہا کہ اسی بات کو صحیح طور پر سمجھنا چاہیے۔ صحیح سمجھنا چاہیے۔ صحیح سمجھنا چاہیے۔ اگر مسلم ہوتا تھا کہ یہ بات کوئی نہ سمجھ سکا۔ اُن کو کہا گیا کہ وہ کبھی سے اتر جائے۔ پھر ریوں کی بادی اُٹئی۔ وہ آخری گواہ تھا۔ ریوں نے اُسے مجھ سے ہلکا سا

اشارہ کیا اور پھر فرما کہا کہ میں نے گناہ ہوں مگر سہارے نے کہا کہ وہ اُن کی دُستے نہیں پوچھ رہا بلکہ واقعات و دریافت کر رہا ہے۔ اُن سے کہا گیا کہ وہ سوالات کو خود سے سنے اور اُن کا تکیہ جواب دے۔ اُس سے کہا گیا کہ وہ مجرم ہے۔ اپنے تعلقات و اوضاع پر بیانی کرے۔ ریوں نے مرقع کا نشانہ اُٹھاتے ہوئے کہا کہ آخری فوجی وکیل واقعہ کے بعد اُن کے ذکر میں نے عرب کی بھی کو چٹا تھا۔ اُن کے مقتول کو میرے ساتھ قبض و حصار رکھنے کی کوئی وجہ تو نہیں تھی۔ ریوں نے کہا کہ اسی دن مائل پر میری موجودگی منسل ایک اتفاق کا نتیجہ تھی۔ سرکاری وکیل نے پھر اُن سے پوچھا کہ اُن کا کیا جواز ہے کہ وہ درامانی خط جن کی وجہ سے سائنورہ پندہ ہوا اور جس کی اصل اُس کے پاس موجود ہے۔ مجھ سے کھو یا گیا ہے۔ ریوں نے جواب دیا:

”یہ میری محض ایک اتفاق تھا۔“

سرکاری وکیل نے اُنٹ کر ازم لگا کر اُن کی یہی اتفاق سے پیچھے ہٹا دیا۔ بہت سے مجرم ہر یکے ہیں۔ وہ سمجھا جاتا تھا کہ کیا یہ اتفاق کی بات تھی کہ جب ریوں نے اپنی دانش کو پٹ رانٹا تو میں نے مخالفت نہ کی۔ کیا یہ بھی اتفاق کی بات تھی کہ میں نے گناہ کی غماز پر ضمانت دی اور کیا یہ بھی اتفاق ہے کہ اُن گناہ کے بعد کے میرے سامنے بیادوں سے صاف صاف میری مردت چٹکتی ہے۔ آخر میں ریوں سے اُن نے پوچھا کہ اُن کو ذریعہ معافی کیا ہے۔ جو میں اُن سے جواب دیا کہ ذریعہ سرکاری وکیل نے چھوڑی کو خطا کرتے ہوئے کہا کہ گواہ بنام قوام ہے اور اُن کا پیشہ دلائی ہے اور یہ بھی معلوم ہے کہ اُن کا گہرا دوست ہوں اور اُن کے ساتھ اُس جرم میں شریک ہوں۔ مجرم کا سزا میں نظر نہ ہوتی۔ کیا ایک ہے۔ یہ ایک بہت ذلیل اور پست کمیشن ہے جو اُن بات سے اور بھی تنگیں جو جاتا ہے کہ اُن لوگوں نے اُن کو ذریعہ معافی قرار دیا ہے۔ مجرم کی سزا کی خستہ شدت سے صراحت اخلاقی احساس سے بالکل غاری ہے۔ ریوں نے اپنے دفاع میں کہہ کہنا ہی چاہتا تھا کہ میرے وکیل نے احتجاج کیا لیکن اُن کو جہالت کی گم گم دور سرکاری وکیل کو بات ختم کرنے دے۔ آخر اُن کو نے کہا:

”مجھے مزید بہت کم کہنا ہے۔ کیا مجرم قہار و دوست ہے؟“ اُن نے ریوں سے پوچھا۔

اُن نے کہا:

”اُن دور میں انگریز تیار ہے۔“

پھر سرکاری وکیل نے نفوس نے بھی یہی سوال پوچھا۔ میں نے ریوں کی طرف نظر ڈالی۔

اُس نے میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھا۔ میں نے جواب دیا:
”جی ہاں۔“

سرکاری دکان نے پیر جیوری کی طرف رخ کیا اور کہا:

”یہ دبی شخص ہے جو ان کے جنازے کے دوسرے ہی دن اپنے آپ کو نہایت
شرمناک برکادی کے سپرد کر دیتا ہے۔ بغیر کسی معقول وجہ کے قتل کا ارتکاب کرتا ہے
تاکہ وہ اپنے مشترکہ اسحق سے چٹکا رہا نہ سکے۔“

پھر وہ بیٹھ گیا۔ مگر میرے دکان کا پیادہ میری ریز پر چکا تھا۔ وہ اٹھا اٹھا
ہوئے چٹا۔ یہ کچھ اس طرح کراس کی آستینیں نیچے نگلی ہوئی تھیں اور اس کی کھٹ اور تھیں
کی سوتیلی منابر پر چلنے لگیں۔ اُس نے کہا:

”اندر کا مجرم پر الزام کیا ہے؟ ان کو دہی کرنے کا یا ایک شخص کو قتل کرنے
کا۔؟“

پانچ بیس پڑی۔ مگر سرکاری دکان نے پیر خطاب کیا۔ اُس نے اپنے دسی لباس
کو درست کرتے ہوئے اعلان کیا کہ یہ سیدھی ساری بات نہ سمجھنے کے لئے نہاب دکان
نکار کا بھڑکائی اور سادگی اور کار ہے۔ دونوں تعلقات لازم و ملزوم ہیں اور دونوں کے برابری
ایک گہرا انوشازک اور حسرت ناک تعلق ہے۔

”جی ہاں۔“ اُس نے سختی سے کہا۔ ”اس شخص پر الزام قائم کرتا ہوں کہ اُس نے
اپنی والدہ کو ایک مصیبت بھرے دن کے ساتھ دیا ہے۔“

اس تقریر کا چابک پرانہ اثر ہوا۔ میرے دکان نے کندھے اچکا کئے اور
اپنے ماتھے سے پسینہ پر خفا۔ لیکن وہ دھراس ہر دہا تھا اور مجھے خیال آیا کہ حالات

میرے کو اتنی نہیں جارہے۔

عزت برخواست ہوئی۔ اپنی گھڑی سے حوالہ کی گواہی میں ہوا۔ چلنے کے
نے چلنے ہوئے میں نے ایک منظر کو دیکھا جسے پیر جیوری کی شام کی فانی رنگ و بو کو پیر
سے پہچانا۔ وہاں جیل کی تار یک گنا می میں مجھے اپنی جھلک کا شدت سے احساس ہوا اور
ایسے میں ایک ایک کر کے اپنے محبوب شہر کے غل غپڑے کی سبھی فانی آوازیں میرے
کالہ میں پڑیں اور اس عالم میں مجھے ایک عجیب راحت محسوس ہوئی۔ انہماک اپنے دامن کا
کھنکھنا فضا میں تھریں انداز میں آوازیں لگنا، چوک کے باغ میں آخری پندوں کی چبک،
میں شرج فرخت کرنے والے کی پکار۔ شہر کی جڑوں پر ٹرام کو سخت موڑ مڑتے ہوئے
تار و فریا اور آسماں کی وہ بیسہمی سرسراہٹ جب رات سامنے نہ گاہ چھوٹنے لگے
میرے لئے یہ سفر ایک اندھے کی مانند تھوڑی دیر میں جانے سے پہلے اس راستہ کو چپ
چپ پہچانتا ہوا۔ پانچ شام کی گھڑی ایسا تھی جس میں مجھے ایک دت کے بعد راستہ کا
احساس ہوا اب ایک مکی می پڑ سکوئی خستہ میری منتظر تھی۔ ایسی خستہ سب سب سہنوں کا
جام و نشان نہ ہوا۔ اس کے بعد میرے لئے سب چیزوں کی مابینت بدل گئی۔ کل کا تصور
اب جیل کی کوٹھڑی کے سوا کچھ نہ تھا۔ جیسے موسم گرما میں فانی اور فانی راجہ معصوم اور شہر فینہ
کی منزل کا پتہ دیتی ہیں۔ بالکل ایسا طرح وہ ڈرائی کی نشانی دیتی بھی کرتی ہیں۔

مگر آخر مجرم کوئی ہے؟ یہ مجرم کی مرث اور زندگی کا سوالی ہے اور مجھے کہنا ہے کچھ اپنی زبان میں۔

مگر غور و فکر کے بعد میں اسی نتیجہ پر پہنچا کہ مجھے کچھ نہیں کہنا ہے۔ بہر حال مجھے یہ صاف نظر آ رہا تھا کہ عوام کی دلچسپی زیادہ دیر تک قائم نہ رہے گی۔ مثال کے طور پر میں سرکاری وکیل کی تقریر جلد ہی سمجھ گیا صرف چند گھنٹے۔ چند شمارے۔ چند دعوت آمیز تقریرے۔ مجھے یاد رہ گئے تھے۔ مگر عجیبی طور پر میری دلچسپی ختم ہو گئی تھی۔

اس کا کافی افسوس میری سمجھ میں خوب آ گیا۔ یہاں کہ میں نے جان بوجھ کر مجرم کا ریکارڈ کیا ہے۔ کم از کم ان کی کوششیں بھی قلمی کردہ یا ثابت کرے۔ جیسا کہ اُس نے کیا: "محضرات! میں یہ ثابت کر دوں گا اور تم کو اسے۔ پہلے تو واقعات کی چپکا چوند روشنی میں اور پھر اس امر کا ذہنیات کی تضادات کے انسرود اور اداس پہلوؤں کی روشنی میں۔"

اُس نے اتنی کی موت کے بعد کے واقعات مگر ان شروع کئے۔ اُس نے میری بے حس، بے پروائی کا ذکر کیا۔ اسی کی عمر کے سلسلہ میں میری جہالت کا بیان آیا، پھر گلے دیا میرا ایک لڑکی کے ساتھ شعل کوڑا اور سینا مانا، وہاں فرانزک کا مذہبی شرع ہو رہا تھا اور آخر کار میرا لڑکی کے ساتھ اپنے گھر لوٹا۔ میں اس کا سہا ہے اس کا مطلب سمجھنے سے قاصر رہتا تھا۔ یاد رکھو! اسے "دانش" کے قتب سے یاد کر رہا تھا اور میرے لئے وہ حرف ماری تھی۔ پھر اُس نے ریموں کا قصہ سنا، میں نے سوچا کہ واقعات پر اس طرح نگاہ ڈالنے سے اُن کا تسلسل ٹوٹ نہیں پاتا۔ وہ جو کچھ کہہ رہا تھا بظاہر معقول معلوم ہو رہا تھا یہ صحیح ہے کہ میں نے ریموں کی رضا مندی سے خط کھینچا تھا، مگر وہ اپنی داشتہ کی

۱۰

اپنے متعلق ہاں، سننا ہیستہ دلچسپی کا باعث بنتا ہے خواہ وہ عزموں کے گھڑے ہی میں کیوں نہ ہو، یہ کارہ اور اپنے وکیل کی تقریریں سننے کے بعد میں یہ کہہ سکتا ہوں کہ اپنے نے میرے متعلق تو بہت کچھ مگر میری ذات کے متعلق زیادہ اور میرے جرم کے بارے میں کم۔ بہر حال ان دونوں تقریروں میں کچھ ایسا فرق نہ تھا۔ میرے وکیل نے بہت زیادہ اور اقبال جرم کر لیا مگر مجرم کی اہمیت کو کم کرنے کے لئے غرض بہت پیش کئے پھر وکیل نے بہت زیادہ رکاری اور حکم کھلا مجھے مجرم ٹھہرا یا مگر کوئی عذر پیش کیا۔ لیکن ایک چیز مجھے ہم طور پر پریشان کر رہی تھی۔ اپنی تشویش اور بے چینی کے باوجود کوئی بارے اعتبار ہی چاہا کہ میں کارروائی میں مداخلت کروں مگر میرے وکیل نے یہ کہتے ہوئے مجھے روک دیا۔ "آپ خاموش رہئے۔ یہی آپ کے لئے بہتر ہے۔"

ایک طرح سے میری اپنے تصور کو اپنی ذات سے خارج سمجھ رہا تھا اور سیدھا سلوک کچھ ایسا تھا جیسے کہ اس کا میرے ساتھ کوئی ذاتی تعلق نہیں۔ بعد میں میری مداخلت کے بغیر جاری رہا۔ میری قسمت کا فیصلہ ہو رہا تھا اور کسی نے میری رائے تک پر غصہ اگرا کر کیا۔ دقتا فرقا میرا ہی چاہتا تھا کہ ساری کارروائی روک دوں اور کہوں:

تو بے اپنی طرف منہ دل کر کے اور ایک ایسا شخص جس کے اخلاق مشتبہ تھے۔ اسے اپنی میرٹ کے برسرے پہنچوں سے نہات پائے کہ کوئی قتل سکے۔ میں نے سال پر میری کے دشمنوں کو اشتعال دلایا تھا۔ جنگ لڑنے کے دوران وہ زخمی ہوا۔ میں نے اس سے اس کا رونا اور دھکا تھا اور میں نے اس کی دستمال کرنے کی نیت سے وہاں لڑا تھا۔ میں نے عرب کو نشانہ بنایا تھا جس کا میرا ارادہ تھا۔ پہلی گولی چلانے کے بعد میں وہاں انتظار کرتا رہا تاکہ مجھے یقین ہو جائے کہ کام واقعی تمام ہو گیا ہے۔ میں نے پھر جان بوجھ کر چار گولیاں بھلی میری اور نہایت بے دردی سے چھائی۔ نتیجہ طور پر یہ صاف ظاہر تھا کہ میں نے ایک طرح سے خود کو قتل کر رکھا تھا۔

حضرات! سرکاری دکن نے کہا کہ میں نے آپ کے سامنے واقعات پیش کئے ہیں جن سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ اسی شخص نے سب کچھ جانتے اور پہچانتے ہوئے معتدل کو مہاراجا سے یہ واقعہ ایسا نہیں ہے کہ کسی نے اشتعال میں اگر غیر ارادی طور پر قتل کیا ہو اور پہچان کی حالت جرم کی سنگینی کو دیکھا کر سکے۔ میں اس بات کو تکیہ کب رہا ہوں؟

اُس نے کہا:

لیونکو کہ شخص ایک معصومی لڑکے کی ہے کہ آپ حالات میں تحقیق کر سکیں کہ جرم کا ارتکاب سوچے سمجھے نہیں کیا گیا ہے۔ یہ فرض کرنا بالکل ناممکن ہے کہ سب اُس نے جرم کا ارتکاب کیا اُسے احساس نہیں تھا کہ وہ کیا کر رہا ہے۔

حضرات! یہ آدمی ذہیب ہے۔ اسے آپ غرور اتفاق کریں گے۔ وہ اتفاق کے معنی پہچانتا ہے اور کوئی یہ نہیں کہہ سکتا کہ اس نے جو کچھ کیا ہے وہاں تا

جائزہ ملے بغیر کیا ہے؟

میں سن رہا ہوں۔ میں نے یہ بھی سنا کہ وہ مجھے ذہنی گروانا ہے۔ اگر میں یہ سمجھ نہ سکا کہ وہ غصہ تھا کہ ایک عام آدمی میں غریبی سمجھ جاتی ہے، ایک جرم میں دھماکا ہی کے خلاف کسی جرم کے خلاف ان الزامات لگانے میں کیا کوئی شدت سے استعمال کی جاسکتی ہے کہ کیا کم مجھے اس سے اچھے غرور ہوئی، اندیشہ میں سرکاری دکن کی ذاتی تقریر پر، جہاں نہ کہ یہ کہہ سکتا ہوں کہ اُسے یہ کہتے ہوئے تھا:

دیکھ اُنکے اپنے غرور کیا ہے جو کہ نہیں۔ حضرات! حالت کے دوران ایک مرتبہ بھی یہ آدمی اپنے غرور کی گنجائش پر غور نہ کرنا نظر نہیں آتا۔

اس امر کو ملحوظ رکھنے کی طرف غور اور میری طرف اٹھی تھا۔ میں نے اپنی رد و بدل تقریر کو جاری رکھا۔ اسے شک مجھے یہ حضرات کو نہ ہی کوئی اصل واقعہ کو دیکھ کر کہتا ہے۔ میں اپنے کئے پر کچھ زیادہ پیشانی دیتا ہوں کہ بعض غرور پر مجھے مزاحمت ہو رہا ہے۔ میں چاہتا تھا کہ اس کو دوسرے طور پر دیکھتے ہوئے کے ساتھ یہ سمجھنے کی کوشش کروں کہ کتنی بات یہ ہے کہ میں زندگی بھر کسی کسی چیز پر پیشانی نہیں دیا۔ مجھے جو کچھ بھی پیش آیا میں نے اس کا ہیشہ زندہ پیشانی سے اشتعال کیا۔ میں ہمیشہ عدل و مستحضر تریب میں اس واقعہ مشتعل رہا ہوں کہ مجھے، اُنکے کے متعلق سوچنے کی کبھی فرصت ہی نہیں لی کہ حتمی طور پر میں حالت میں مجھے بتا کر دیا گیا تھا کہ کسی سے اس میں بات نہ کرنا۔ مجھے یہ حق حاصل تھا کہ میں محبت کے جذبات کا اظہار کروں۔ ایک نئی اور غیر خواہی کا حق مجھ سے بھیج دیا گیا تھا میں نے پھر تقریر سننے کی کوشش کی۔ اب دیکھ میری رویت اور ضمیر کے متعلق کچھ فرما رہا تھا۔ وہ کہہ رہا تھا:

حضرات! اس کو ہر جہاں قوی طرف سے گردہ کچھ پائیں مسکا سیک قویہ ہے کہ اس کو ضمیر ہی نہیں ہے۔ اس میں انسانیت سر سے تھک سب سے اور غلامی اصول حسن جو انسان کو ممتاز کرتے ہیں اس آدمی کی حق تک رسائی نہیں ہیں۔

بیشک: "اس نے کہا: ہاں اس آدمی پر خیر کی تمت نہیں دوسرے وہ خوبیا جو وہ کسی حاصل نہیں کر سکے گا وہ کھو بھی سکتا ہے۔ مگر جہاں تک اس عادت کے تعلق ہے میں رد واری کے باوجود منفی نظریہ کو بالائے طاق رکھ دیتا ہوں۔ یہ کام اگر تمام نہیں ہو سکتا۔ دل وادب، فکری اصولوں کا تقاضا یہ ہے اور سب سے بڑھ کر یہ کہ جب کسی کا دل ایسا ہو جیسا کہ اس شخص کا پایا گیا ہے تو وہ ایک ایسا گڑھا بن جاتا ہے جس میں سارا سماج ڈوب سکتا ہے۔"

پھر اس نے اتنی کے ساتھ میرے دور کا ذکر کیا۔ اس نے ان باتوں کو دہرایا جو وہ بحث کے دوران کہہ چکا تھا۔ گراہی کی بازمیرے جرم کے متعلق اس کی تقریر بہت ہی دلجوئی۔ آخری نتیجہ کہ انہوں نے میرے طرف دوجہ کی گئی کے سرا اور کسی بات کا سرا نہ کیا۔ ان کو اس وقت تک جب سرکاری کوئی اور ایک سرخ موٹی کے بعد ایک ہی اور بہت اثر پذیر آواز میں کہا:

"حضرات! یہی عادت کی ایک نیت ہی خونخوار اور شرمناک جرم کا فیصلہ کرنے والی ہے ایک باپ کی عادت جیسے کے ناموں۔"

اس کے مطابق ایسے حالات جرم کے سامنے تھکر پکڑنے لگتا ہے۔ اس نے امید ظاہر کرنے کی جرات کی کہ

"حضرات! آپ لیٹر کسی کمزور یا اور نرم دلی کے منظر تو بڑھ کر گئے۔"

بہنوں! اس گندہ کو نے بڑھ کر بیدار کرنے سے تاجر تھا ہم کو بھی نئے رنگ کا کیا تھا۔ اگر یہ ایک خونخوار بات ہے نہیں اس کو یہ کچھ عورتوں کو بھی ہوتا کہ میرا جرم تھا ہی نہیں اور انصاف تک ہے جبکہ اس آدمی کو جس نے اپنے باپ کو قتل کیا ہے اس کا کہا تھا کہ ایک شخص جو چاہیے گا کہ غلامی خرید و قتل کر سکتا ہے وہ دولت کی انتہائی پستیں میں گر جاتا ہے اور اس قتل کے لوگوں کی طرح بن جاتا ہے جن کے وہ انسانیت کے حق سے لڑیں گی۔ میرا دل پہلی حالت ناگزیر دوسری حالت تک پہنچا رہا ہے اور یہی منطق کا تقاضا ہے۔

مجھے یقین ہے حضرات! اس نے آواز بلند کرتے ہوئے کہا کہ آپ میرے خیالات کو کشادگی اور سب سے پہلی گئے۔ اس میں یہ کہوں کہ یہ آدمی جو سب سے پہلے چل رہا ہے اس عادت کے قتل کو بھی جرم ہے۔ ہر گز فیصلہ نہ دلی ہے۔ فیصلہ کو بھی مزاحمت چاہئے۔

یہاں سرکاری دلی نے اپنے چلنے سے اپنے سے پہلے پوچھا۔ آخر اس نے کہا کہ ایک خزن ناگوار اور دھوکا ہے لیکن ہاؤس ہے کہ وہ اسے بے عزت و خطرہ کرے۔ اس نے کہا کہ مجھے اس سماج پر کوئی حق حاصل نہیں جس کے بنیادی اصولوں کو میں نے حقارت سے ٹھکرایا ہے اور مجھے کوئی حق نہیں پہنچتا کہ میں اس جرم کے بعد انسانیت کے نام پر دم کی درخواست کروں جب کہ میں نے خود انسانیت کے سارے اصولوں کو نظر انداز کر دیا ہے۔

"یہی آپ سے آدمی کے سر کا تقاضا کرتا ہوں اور یہ تقاضا میں آپ سے نیت عدالت اور ایسا ہی سے کر رہا ہوں۔ حکمت کے تیرے طریق تجربہ کے دوران کی مرتبہ میں نے

میرا کہتے تھے وہ چھوٹوں کی باتوں کا وہ میرا سیکر ہے۔ انہی نے مزید کہا:

یہ جہاں ہیں حضرت کے جہاں کی رہائش تھی وہ کتنے متعلق اس تہذیب و تمدن کے تھے۔
کیونکہ دنیا گیا ہے کہ نہ کہ ترکہ اور ایسے اداروں کی خدمت اور فوائد کے ثبوت میں یہ کہا جاسکتا
ہے کہ وہ حکومت ان کی مالی امداد کرتی ہے۔

نوٹ اس نے جنازے کی بات نہیں پھیرنی اور میں نے صغیر کو کیا کہ تحریر میں کسر
اس بات کی روگئی ہے۔ لیکن اس سب لمبی بحثوں کے باعث ان ختم نہ ہونے والے
اوقات کی وجہ سے جہاں کے دو دلا میرے خیمہ کے متعلق تقریری جرتی رہی مجھے احساس
ہوا کہ سب متنازعہ رنگ، برہم اور دھندلائی جرتی ہے اور میرا سر جھکا رہا ہے
اور صاف طریقہ پر کچھ ہے نہیں پڑتا۔ صرف ایک واقعہ نمایاں ہے۔ یہ وہاں پہنچ کر تقریب
نرسی دھاگہ کو میں نے اٹھ سے آٹھس کریم پہنچنے والے کی طرح کی آواز سنی۔ ایک باریک
اور تیز آواز جو کہیں کہیں غفلتوں کے بناء کو میرے کمرے کے آگے آگے تھا۔ پھر میرے ذہن میں
رواں کا ایک عروانی اٹھا آ۔

آخر میں مجھے یہ یاد ہے کہ اپنے وکیل کی تقریر کے دوران میں حالات اور مجھ
کی شہادت کو جان کر پانچواں کو چار بجے پہنچ گیا۔ ان کو تم کہہ چاہئے کہ اسے کو کل میرے
اور میری رہائش گاہ میں اس زندگی کی یادوں سے وہ کیا جو اب مجھ سے کچھ حقیقی در
تھا کہ وہیں میری کبھی بہت سی چھٹی چھٹی اور ذرا خوشیاں یاد تھیں۔ مگر ان کی خوشیوں
کو اطمینان میرے مجھے اس وقت کہ تمام کام اعلان — ماری کا ماں اور ان کی وہ بھی — یہ
پہنچ گیا مگر میرے لئے بیکار ہو چکی تھیں۔ مگر ان کی یاد بہرہ پر تھا، یہ تھی۔ یہ یاد میری
زندگی کا سب سے قیمتی۔ یہ ان حالات میں جو کچھ چور تھا، اسے حاصل تھا۔ مجھے مرنے کی کیفیت

محسوس ہوئی اور مجھے صرف ایک ہی نیاں اور اٹھا کر اسے گیزنگو روکروں۔ پیکار میں جاتا تھا
 کہ اپنی کوٹھڑی میں لوٹ جاؤں اور نہ سہ — اہلی کی کیفیت غم میں ہوئی تھی کہیں
 نے اپنے دل کو آخری جگہ کھنکھاتا:

نیکو چوری ایک ایسا نذر کام کرنے والے کو جو ایک لمحہ کے لئے گمراہ ہو گیا تھا۔
 موت کے منہ میں دیکھیں دسے گی:-

اُمی نے ان حالات کو نہ کر کہا جو حیرت کو تخفیف کرتے ہیں اور جو وہ پہلے ہی بیان کر چکا تھا اور کہ اس بات کو غلط سمجھنا چاہیے کہ جبرم پہلے ہی کہتے ہیں کہ جبرم پر پریشانی ہے اور نہ سزاؤں کے لئے موت کافی ہے۔

عزالت ملوثی ہوئی اور کچل تھک کر میسر کی۔ مگر اس کے کچرہ سانچوں اس کی طرف آتے
اور ان کے سے ٹکراتے ملاتے۔ میں نے ٹٹا:

کمال کیا ہے۔ یہ بہت خوب بحث کی۔

اس میں سے ایک نئے مجروح کہا:

ایہ تمام بھی واقعات کو بھٹہ ہوا!

میں نے بھی کہہ دیا کہ تقریر خوب تھی، مگر میں نے غصہ کر کے یہ تعریف کی کیونکہ یہ بہت
تھکا ہوا تھا۔

اسی اثنا میں باہر دن طلوع ہوا تھا اور گرمی کم۔ ہر جہتی تھیں گلی کوچوں سے آوازوں کے کچھ مہیب پہلوؤں سے مجھے شام کی خستہ گلی کا احساس ہوا۔ وہاں ہم سب متفرق ہو گئے تھے۔ جہیز پور کا انتظار مجھے تھا اس سے میرے علاوہ کسی اور کو تعلق نہ تھا۔ میرا بے ایک مرتبہ پھر دولت کے کمرہ پر گلاہ ڈالی۔ سب کچھ بالکل پیسے کی طرح تھا۔ میں نے انبار

نے اسی سے اتفاق کیا کہ یہ معاملے پر غصہ سے دل سے غور کرنے کے بعد یہ سب کچھ ایک قدرتی امر معلوم ہوتا تھا۔ فتنہ کی صورت میں خواہ مخواہ غلط فہمیاں کا ذخیرہ بن جائے گا۔ ہر صورت میں اسے وہی سنا کہ کہہ کر وہ عام طریقہ سے میری اپیل کر سکتا ہے۔ لیکن اسے فتنہ تھا کہ فیصلہ ہمارے حق میں ہو گا۔

ہم سب بہت اذکار کے پیداوار خیال ہے کہ کوئی نوجوان غصہ نہ پورا کرے۔ فتنہ بھی میرا دیکھ لیتا ہے۔ دیکھتے ہوئے غصہ نہ پورا کرنا۔

جیوری کا صدر جیوری کی سفارشی پیش کر رہا۔ ہم فیصلہ کے اعلان سے پہلے عدالت میں داخل نہیں ہو سکتے۔

کچھ دروازوں کے کھلنے کی آواز آئی۔ لوگوں کی سیر حسیوں پر بھاگنے کی آواز آئی۔ یہ نہ تھا کہ سیر حسیوں کی قربت تھی۔ پھر مجھے ایک شخص سی آواز عدالت میں کھڑے تھے۔ ہر سی آواز دق۔ یہ سب غصہ دہا دہا کی۔ عدالت کا کمر کھلا کر اسے کی خورشید مجھے گھر سے گھر تھی۔ یہ غصہ کی نوعیت تھی۔ یہاں وقت جاری ہوئی جب میں نے کم و فراوانی کو پہلے مرتبہ مجھے سے غصہ نہ ہونے دیکھا۔ میں نے داری کی طرف اٹھ کر نہ دیکھا۔ مجھے فرصت ہی کہاں تھی۔ کیونکہ صدر جیوری ایک عجیب انداز سے کچھ اہل طرح کیا تھا۔ میرا رولز اس کے حرام کے نام پر چڑا ہے۔ یہ کتنا ہلکا ہے۔

اس وقت مجھے معلوم ہوا کہ وہ اسامات بن لادن کے دل میں تھے۔ میں ان کے چہرہ کی یہ طرح دیکھتا ہوں۔ مجھے یقین تھا کہ وہ جیوری کی اذکار کے رعب میں رہا ہی نہ ہو۔ میرے ساتھ جیوری شہادت دیتی۔ دیکھنے میں لگاتی رہا تھا۔ پھر میرے اذکار میں کوئی خیال نہ آیا۔ میرے کان میں یہ آواز گھونکنے لگی تھی کہ مجھے کچھ اور

دیکھ کر کہہ رہا تھا۔ کوئی دھمکتا ہوا تھا۔ میں نے یہ بھی دیکھا کہ وہ عورت جوشیہ کی طرح حرکت کر رہی تھی۔ وہ اس سے مجھے خیال آیا کہ ساری کارروائی کے دوران میں نے ایک بار بھی داری کو نظر نہ کیا تھا۔ کونسی دیکھیں۔ میں نے اسے اور فرسوش نہیں کیا تھا۔ اگر میں اسی قدر مصروف تھا تو میں نے اب اسے سلیس اور جوں کے اور نہ دیکھا۔ مجھے ہر سہا دیکھا۔ اس نے مجھے اذکار سے ایک ہلکا سا اشارہ کیا جیسے کہ وہ کہہ رہی ہے۔

نہ پورا کرنا۔

ادریں نے اس کا چہرہ دیکھا۔ ایک گونہ پریشانی گر سکتا تھا جو انکی میں نے غصہ کیوں کر میرے دل پر ڈالنا چاہتا ہے۔ ادریں اس کی سکونت کا جواب تک نہیں دے سکتا۔ عدالت کی کارروائی پھر شروع ہوئی۔ کسی نے جیوری کے سامنے شہادت کی فہرست پڑھی۔ میرے کان میں کچھ مجھے پڑے۔

’شہادت کا قصہ۔ دل۔‘

جیوری، ہم پہنچ گئے۔ مجھے ایک عجیب سے کمرے میں لے جایا گیا جہاں میں پہلے ہی انتظار کر چکا تھا۔ اداریں میرا کوئی پتہ نہ دے سکتے تھے۔ وہ بہت باتیں کر رہا تھا۔ وہ مجھ سے جیسے متاثر ہے۔ باتیں کرتا رہا۔ اداریں قدر و قدر اور طریقے سے پیش آیا کہ کونسی پہلے نہ آیا ہو۔ اس کا انداز تھا کہ سب غیر متاثر رہے گی اور میرا ہلکا سا پتہ سال کی تیرہ شہادت سے ہر بلائے گا۔ میں نے اس سے پوچھا کہ سزا ختم کرنے کی کیا گنجائش ہے۔ اس نے کہا کہ کچھ نہیں ہو سکتا۔ فتنہ کی کوئی گنجائش نہیں تھا۔ کیونکہ اس سے اس کا خیال تھا کہ جیوری بے برکت تھا۔ یہاں سے اس عدالت کے فیصلہ کی تائید ملے گی۔ میرے کان میں آواز تھی۔ اس نے مجھے بتایا کہ خواہ مخواہ فیصلہ فتنہ کی درخواست نہیں دینا چاہیے۔ بات تو طویل ہوئی اور میں

تو نہیں کہنا۔ میں نے ذرا سوچا اور پھر کہا:

”نہیں۔“

اس کے بعد پولیس مجھے وہاں سے لے گئی۔

11

مزید سبب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں : www.iqbalkalmati.blogspot.com

میں نے ابھی تیسری مرتبہ جیل کے پادری کو سننے سے انکار کیا ہے۔ مجھے کچھ نہیں کہنا ہے۔ میرا کچھ کہنے کو جی ہی نہیں چاہتا۔ لیکن میری تھوڑی دیر بعد مجھے اس سے ملنا ہی ہوگا۔ اسی وقت مجھے جس بات میں دلچسپی ہے وہ صرف یہ ہے کہ عہدہ کی مشین سے کیوں کر چھٹکارا پانا جائے۔ کیونکہ قضا سے گزرنے کی راہ تماشائی کی ہاتھ میں تھوڑی سی کٹھنری بولی دی گئی ہے۔ اسی جگہ جہاں میں اب معروف القوام میں پڑا ہوا ہوں میں آسمان کو دیکھ سکتا ہوں۔ اس کے سوا دیکھنے کو اور دھرا ہی کیا ہے۔ میرے دن اسے دیکھتے دیکھتے کٹ جاتے ہیں۔ اس کے بدلے ہوشے رنگوں سے مجھے دلی اور لذت کا پتہ ملتا ہے۔ بیٹھے بیٹھے میں سر کے پیچھے ہاتھ رکھ لیتا ہوں اور اسے دیکھتا ہوں اور انتظار کرتا رہتا ہوں۔ معدوم نہیں میں نے کتنی مرتبہ اپنے آپ سے پوچھا کہ کیا کوئی ایسی مثال بھی ہے کہ کوئی ملزم جسے موت کی سزا ملنا دی گئی ہو وہ قتل سے پہلے پناہ لے لے گا۔ اس کا سہارا تو رکھ لے گا۔ پھر میں اپنے آپ پر حاکمیت کرتا ہوں کہ میں نے پہلے موت کے واقعات کو کیوں زیادہ تو مجھ سے نہیں پڑھا۔ اور کی کو ہمیشہ ایسے معاملات میں دلچسپی لینا چاہئے۔ مجھے کچھ علم نہ تھا کہ کابھی ہونے والا ہے اور لوگوں کی طرح میں نے بھی اخباروں میں مرنے والی روئیدادیں پڑھ لیں

تینٹا خاص طور پر تفصیل سے بیان ہو چکے تھے مگر یہاں تحقیق و تجسس کو شوق کے تھا کہ انہی غور سے پڑھنا۔ شاید انہی میں خداداد کوئی سنو اقدار آجاتا۔ مجھے خوب یاد چلتا ہے کہ میرے ہی رکھا تھا کہ ایک مرتبہ تو شیخ کے پیچھے لڑک گئے تھے۔ اگرچہ ایک ہی مرتبہ واقعات کی سہ رم چال میں خوش قسمت تھے ایک ڈنگو اور کارواں کا تھا۔ صرف ایک مرتبہ! میرا خیال ہے کہ ایک طرح سے یہ دوسرا واقعہ ہی میری تسلی کے لئے کافی تھا۔ بقیہ کی میرے جذبات پر۔ یاد کرو دیتے۔ جو ہوتا ہوں کہ کم از کم ایک موقع میں تو عزم پکڑا جاسکے گا اسی ذمہ داری سے چلتی ہندی میں خطرہ بھی ہے اور قسمت آزمائی کا موقع بھی۔ اگر صرف ایک مرتبہ کی کامیابی نصیب ہو جاسے تو سب کچھ حل ہوجائے گا۔ معرفت ایک مرتبہ۔ ایک طرح میں لئے سوچا کہ میرے لئے میں سے ہائی کام پیز دل کرے گا۔

انجانات اکثر ایک نفع کا ڈنک کیا کرتے ہیں جو اس کے کہنے کے مطابق ہمیں سماج کو ادا کرتا ہے۔ مگر اسی بات سے قوت تشکیک کی تسکین نہیں ہوتی۔ اب ہم مشد توفرو کے الکانات کا تہہ رنگ دلی رسوم کے باہر ایک جست۔ آزادی کی طرف حاکمات کی ایک سرپٹ دوڑ رہی ہے۔ سب امیریں وابستہ ہیں۔ ہزاری کی آخری چال۔ قدرتی طور پر کہنے کی نظر میں امیر میں ڈنک دہان گوہر کی ایک باڈے زخمی ہر کر گر جی میوٹ خونی کے بعد فرا کو خیال بھی محض ایک تکلف اور گوشش پیہر وہ نظر آنے لگا۔

پانی نیک خواہی کے باوجود میں اسی ایمان کی گت فی قبول نہ کر سکا کیونکہ آخر کار میرا یہ فیصلہ سرت پر مٹنا سب تھا اور اس کی بنا واقعات کی وہ کڑی تھی جو فیصلے کے بعد ظہور میں آئی۔ یہ واقعہ کہ فیصلہ شام کے پانچ بجے کی بجائے آٹھ بجے مٹا گیا۔ یہ امر کہ فیصلہ شاید اس سے مختلف ہو سکتا تھا۔ یہ بات کہ یہ فیصلہ جیوری کے فیصلہ قسم کے

لڑگوں سے کیا تھا اور یہ امر کہ فیصلہ ایسے غیر واضح نظریے کے ماتحت کیا گیا تھا۔ میں تو اعلیٰ کے حرام کے نام پر روایات کی بالائی کیوں نہیں؟ یہ سب واقعات میرے خیال میں عدالت کے فیصلہ کی سنجیدگی پر اثر انداز ہو رہے تھے۔ میری حال میں یہ حقیقت قبول کرنے پر مجبور تھا کہ فیصلہ جوتے ہی اس کے تناجی اتنے ہی محسوس اور سنجیدہ ہو گئے ہیں جتنی کہ وہ روز میں کے سابقہ میں کر سکتا تھا۔

ایسے میں مجھے ایک کہانی یاد آتی جو اتنی آج کے متعلق مٹا کر تی تھیں۔ جیسے آج یاد نہیں۔ ان کے متعلق سوائے اس بات کے جو اتنی آج کی تھیں۔ مجھے کچھ اور علم نہ تھا۔ اپنی میں سے ایک یہ بھی کہ ایک دن وہ ایک تالی کی پھانسی دیکھنے گئے۔ اذان جاتے تھے خیال ہے کہ ان کی طبیعت ناماز پڑھنے لگی۔ مگر حال وہ وہاں گئے کہ وہ واپس آکر دروازہ سے کہتے رہے۔ یہ کچھ کہیں دقت تھے آج سے نفرت سی ہو گئی مگر اب مجھے مسجد آتی کہ یہ ایک مسجد ہی تھی اور مسجد بھی کچھ کرنا آتی کیونکہ آدمی کے لئے پھانسی سے زیادہ اور کوئی سی چیز دلچسپ ہو سکتی ہے۔ صبح معنوں میں ہی ایک چیز سے جسے دیکھنے میں آدمی کو دلچسپی ہوتی ہوتی ہے میں نے فیصلہ کیا کہ اگر سراسر کبھی جیل سے نکل کر ہوا تو میں سب یہاں لایا دیکھنے جایا کروں گا۔ اگرچہ اس امکان کا سچا بھی ایک غلط فہمی اگر میں خیال سے کہ میں ہاں میں کے دوسرے سٹے کو پھانسی کرنا ایک صبح کس نہ ہو سٹاں پھانسی دیکھنے پہنچ گیا ہوں اور جیسے آج کے بعد گھر کو میں نے بھی تے کی ہے۔ میرے دلیں خوشی کی ایک ہزار اور حوج دوڑ گئی۔ مگر میں معقول بات نہ تھی۔ میری یہ فطرت تھی کہ میں ایسے خیالات کی رو میں بھی نہیں۔ ایک طویل مجھے اس غصہ کی بات نہ کی کہ اپنے کمر میں آجے آج گھارنا تھا۔ میرے دست تھے

دے سنتے اور میں بے بس ہو رہا تھا۔

مگر تمدنی بات ہے کہ انسان ہمیشہ تو معتدل باتیں نہیں کر سکتا۔ مثال کے طور پر کئی مرتبہ میں نے قانون کے نئے منصوبے تیار کئے۔ میں نے سزاؤں میں ترمیم تجویز کی۔ میں نے سوچا کہ جرم کو ایک موقع دینا نہایت ضروری ہے۔ ہزاروں میں سے ایک کا نشانہ اس سے بچا ہو جائے۔ مجھے یہ بھی خیال آیا کہ کوئی ایسی کمیونٹی تلاش کی جائے جس کے بچے ہی مرلین دیں یہ کم از کم نو مرتبہ تو زندگی سے نجات حاصل کر سکے۔ مجھے مرلین کا نقطہ سوجھا، شرط یہ تھی کہ آدمی مرلین ہو لیکن پھر سوچنے اور سمجھنے کی معاہدہ پر غور کرنے کے بعد میں اسی نتیجہ پر پہنچا کہ مرلین کو دے دے پھر اسے میں یہ برافض ہے کہ اس سے بچنے کی کوئی صورت ہی نہیں، بالکل کوئی نہ رہت نہیں۔

مختصر کہ چھرے کا ایک ادارہ مرلین کی موت کا فیصلہ کر دیتا ہے۔ یہ ایک ایسی ہی مثال تھی۔ یہ بڑا خوب تھا۔ بالکل منطقی فیصلہ جس سے غلطی کوئی گناہ کی ہی نہیں تھی، مگر کوئی غیر معمولی واقعہ ہو جاتا ہے اور ایک آدمی اور اخطا ہو جاتا ہے تو مسند پیر سے شروع ہو جاتا ہے مگر جب مباحثہ اس بات سے ہوتا ہے کہ جسے موت کا حکم دیا گیا ہے اس سے یہ توقع بھی کی جاتی ہے کہ وہ اس امید پر ہے کہ اس کی جان میرا دشمن یا ناکام میری طرف پر انجام دے گی۔ میں نے کہا کہ اس نظام میں تو یہ مڑا نقص ہے۔ اس طرح سے یہ بات سچ تھی مگر ایک اور طرح سے میں نے بانٹنے پر بھی غور کیا کہ ہر اپنے نظام کا یہی تو مزہ ہوتا ہے۔ مختصر یہ کہ جسے موت کا حکم ملا ہے وہ مجبور ہے کہ اخلاقی طور پر اپنے عقائد سے تعاون کرے۔ اس کا بھلا اس میں ہے کہ وہ دوسری غیر کمی کا وارث کے ایک دوسرے کا ساتھ دین۔

میں اسی نتیجہ پر بھی پہنچا کہ ایسی ایک ایسی معاملات پر جرمی نے سوجھ بچار کیا ہے وہ کچھ صحیح نہیں ہے۔ ایک عنصر سے میں نے سمجھ دکھا تھا۔ معلوم نہیں کیوں غلطی دہرائی تھی۔ اگر جانے کے لئے میرا خیال ہے کہ ایک منہ چہرے پر جانا ہوتا ہے۔ میرا خیال تھا کہ اس کی وجہ ۱۹۸۹ء کا انقلاب تھا۔ میرا مطلب ہے کہ اس کی وجہ وہ سب کچھ تھا جس سے اس موضوع پر پڑا یا دیکھ رکھا تھا۔ یہ بھی ایک نتیجہ ہے۔ انباروں میں ایک تصویر دیکھی کہ ایک مشہور و معروف غم کی پیمانی کے مسئلے پر بھی قلمی اور حقیقت کشین سیدھی سادی زمین پر چڑی چڑی تھی اور میرے انوار سے وہ کمبیں زیادہ مختصر نکلی۔

وہنا بھی بھلا ملک قلمی اور میں مرلین کی اس سے بچنے کیونکر سمجھ سکا تھی۔ اس کا خست نہایت نفس قلمی اور میں اس کی جزئیات کا دیکھ کر بہت متاثر ہوا۔ وہ بہت عرصہ اور چھٹی تھی۔ آدمی میں کبیز کر جاتا ہوں اس کے متعلق ہمیشہ اس کے خیالات بہت مزید ہو جاتے ہیں۔ برعکس اس کے اب مجھے دانی چڑا کر بات تو یہی سادی تھی۔ نفسی اس طرح پر قلمی میں پروردگار نہیں اس کی حیثیت چڑھایا جاتا ہے۔ اس کی طرف آدمی ایسے ہی قوم بڑھاتا ہے جیسے کہ کسی ہاتھ دے دے جا رہا ہو۔ یہ خیال مجھ پر دشمن کی سنا ہند چہرے پر چڑھنا، آسمان کی طرف ہواؤں کا یعنی ایک طرح سے اس دنیا کو نیچے چھوڑ دینا۔ یہ بات تو تصور کو بھی گتھی تھی مگر نتیجہ نے اس خیالات کا ساتھ توڑ دیا۔ لے تو تیز سے ہاتھ دینا ہے۔ مقررہ کی سٹش زندگی اور بہت سے ضابطے کے ساتھ۔

وہ اور چیزیں تھیں جن کے متعلق میں تمام وقت سوچتا رہا۔ غلط صبح اور اپنی پائل۔ میں اپنے آپ کے ساتھ بھٹاؤ اور کشش کرنا۔ ہاں اس کے متعلق کچھ

اور نہ کوچوں۔ مگر میری سرچنے کی طاقت تیز تر ہوتی گئی۔ میں آسمان کو گنتا اور اپنے آپ کو نہرواتی اسی ہی اور زیادہ تجسس جیتے پر آمادہ کرتا۔ جب آسمان بزرگ ہونا شروع ہو جاتا تو میں سمجھتا کہ شام کو کس قسم ہے۔ میں نے کوشش کی کہ میرے خیالات کا انداز بدل جائے۔ چنانچہ میں نے اپنے دل کی دھڑکی کو مستند شروع کیا۔ میرے ذہن میں بھی یہ نہ آسکتا تھا کہ یہ کئی ہی آواز ہے ایک صرصر سے یہ آواز مقررہ ہے مگر کبھی بند ہوجاتا ہے۔ مگر یہ صرصر عین کی کم یا کبھی کبھی بہت زیادہ ہوتی ہے۔ میں نے کوشش کی کہ ایک ایسے صرصر کا تصور کروں جب میرے دل کی دھڑکی کی آواز سے ہر گشت میرے دل کا ملک پہنچنے کے لیے جگمگ کرکٹیں بیوہ ہوتی۔ صرصر آفتاب اور میری دل آواز تو ہیں کہ وہیں رہے۔ میں آخر ان کو تیر پر پہنچا کہ خیالات کے نظریہ کو گننے کی کوشش کرنا فضول ہے۔

وہ ہمیشہ پر پھٹتے ہی مجرم کو قتل۔ کے لئے سے جایا کرتے تھے۔ یہ مجھے معلوم تھا۔ چنانچہ میری رائی پر پھٹنے کے انتظار میں کھستیں۔ مجھے کبھی یہ محسوس معلوم نہ ہوا کہ مجھے کئی بے خبری ہیں اچانک آئے۔ جب کوئی واقعہ ہونے والا ہو تو میں بہتر سمجھتا ہوں کہ میں اس کے لئے تیار ہوں۔ یہی وجہ تھی کہ میں دن کو چلکا سا ادھم مینا اور رات بھر نہ سوتا میں بے خبری سے انتظار کرتا رہتا کہ اوپر والے میری گنبد سے پر پھٹنے کا کوئی اشارہ ملے۔

شک و شبہ کی وہ گھڑی بڑی سخت گزرتی جب مجھے خیال آتا کہ معمولاً وہ اسی وقت آیا کرتے ہیں۔ میں آدمی رات گئے انتظار کا گھڑیاں گنتا رہتا۔ میرے کان میں کبھی اس تھد بڑک اور کبھی آوازیں نہ چڑی تھیں۔ بہر حال میں یہ کہہ سکتا ہوں کہ ایک طریق سے یہ خوش قسمت تھا کہ اگر اس نام حور کے دوران میں نے کبھی کسی کے پاؤں کی

آہٹ نہ مٹتی۔ اتنی اکثر کیا کرتی تھیں کہ انسانی کھجور کی طور پر خوش نہیں ہوتا اس بات کا مجھے جہن میں بہتر بہرہ واجب آسمان پر رنگ کھنکھتا اور جب ایک نیا دن میری کوشش میں ملتا ہوتا۔ یوں بھی تو رہ سکتا تھا کہ مجھے کسی کے پاؤں کی آہٹ سنائی دیتی اور میرا دل خوف کے مارے دھڑکنے لگتا۔ بالکی میں کبھی آہٹ پر نہ ہوا وہ اسے کی طرف پھٹتا۔ پٹ پر کان لگا کر بالگوں کی طرف گشت پر آواز دہتا حتیٰ کہ مجھے اپنا سامنی سنائی دینے لگتا۔ مجھے خوف رہتا کہ میرا وہ گشت جائے گا۔ کیونکہ اگر مجھے ایک ایسی آواز سنائی دیتی تھی جیسے کتے کے معلق ہیں۔ نہ صرف یہ کہ جو۔ مجھے اپنے دل کی دھڑکی سنائی دینے لگی اور میں سمجھتا کہ مجھے زندگی کا ایک اور دل کی کیا ہے۔

پھر وہ میری رائی کا حصہ رہتا۔ میں نے اس کے سیمہ پہنچاؤ پر فخر کیا۔ یہ میرے مناسپ کیا کہ انور اس کا نتیجہ کیا ہے اور میرے حارس سزاوار کا ب لہاب کیا ہے یہی ہمیشہ تھار کیا۔ تھے میرا کہ پہلو کو کہتا۔ میری رائی پر گرتی تھے۔

”خوب خواب مجھے مرنے سے۔“

خدا رحمت سب لوگوں سے ذرا پیچھے رہتا تھا۔ یہ تو واضح ہی تھا مگر سامنی دنیا ہوتی ہے کہ زندگی اس تالی میں کو قفل جینے کے لئے تھی ستمناں پر داشت کی جانب سے۔ اور حقیقت مجھے معلوم تھا کہ نہیں ہر کی عمر میں یا ستر برس کی عمر میں مرنا اور ان میں کوئی خاص فرق نہیں ہے کیونکہ ہر دور کا حال میں خودی طور پر دو صرصر سے اور دو صرصر میں زمانہ وہی لگی اور دنیا کا یہ سلسلہ خبروں پر جاری رہے گا۔ بخیر یہ کہ کوئی بات صاف نہ تھی ہوا وقت صوفان نہ میری موت کا تھا۔ کہ یہ اب اسے گی یا نہیں برس بعد۔ اس صرصر میرے استدلال میں جو بات نہ دھکتی تھی وہ۔ تھی کہ آئے والے ہیں برسوں کا خیال مجھیں

اپنی ذات کے ساتھ ایک نور مستحکم تھا۔ اسی پیدا کر رہا تھا گھریں نے، اسی خدایا کا
 لکھ گھٹ دیا۔ یہ تصور کرتے ہوئے کہ اگر موت تک جانا مزدوری ہی مختار تو میں برائی
 کیا معلوم میرے خیالات کا کیا دھڑک جیگا۔ جس وقت آدمی جانی دیتا ہے وہ کیسے اور
 کیونکر مرنے ہے یہ لامعنی سوال بن جاتے ہیں۔ یہ تو ظاہر ہی ہے۔ پھر اس شکل پر پہنچ کر اسی
 استغناء میں پھر میں معنی کی غائیب کی کرتا تھا اسے نظر انداز کرنا آسان نہ تھا۔ پھر مجھے
 اپنی اپنی کی لامتناہی کا امکان قبول کر لینا چاہیے۔

اسی معروف اس لمحہ — یوں کہتے کہ مجھے تپ چھینتا ہے کہ میں اپنے آپ
 کو دوسرا مٹاؤ نہ قائم کرنے کی اجازت دوں۔ یعنی مزائے موت کو سزائے قہر میں بنا
 جانے کا حکم مل گیا ہے۔ فوراً خون کی ایک تندہ تیز میرے سر سے مارے بدن میں سرپٹ
 دوڑ گئی اور میری آنکھوں سے ایک ناقابل بیان خوشی کی سنسنی سے آنسو چھینکے گئے

اسی سے میری
 گرفت کچھ کم ہوئی۔ مگر واجب تھا کہ میں خوشی کے اسی طوفان کو دانی سے تھانے کی کڑکڑ
 کروں۔ اسی امکان پر غور کرتے ہوئے لازم تھا کہ میں اپنے حواس کو قائم کر لوں تاکہ مجھے
 امکان سے جڑا حصار ہی بندھی تھی اس کا بھی اعتبار نہ اٹھ جائے۔ جب مجھے اس میں کامیابی
 ہوئی تو مجھے گھٹے بھر سکون نصیب ہوا۔

کچھ ایسا ہی ہوا تھا جب میں نے ایک اور مرتبہ پادری کو شے سے انکار کر دیا
 تھا۔

یہ میٹھا تھا۔ ایک قسم کی کچی سی سنہری روشنی سے جوائی پر پہنچی رہی تھی اسی
 شام کی آدھا اندازہ کر رہا تھا۔ میں اپنی ایل رو کر نہ دلا تھا۔ مجھے خون کی تیروں کا احسا

ہو رہا تھا۔ جو میرے اندر ڈالنا۔ موجود تھیں۔ یعنی مجھے پادری کو شے کی ضرورت نہ تھی
 پھر بہت عرصہ کے بعد مجھے ماری کا خیال آیا۔ ایک مدت سے اس نے مجھے خط کشا
 چھڑا دیا تھا۔ آج کی شام میں نے سوچا اور اپنے آپ کو کہا کہ شاید وہ ایک ایسے آدمی
 کی جیسے موت کا حکم مل چکا ہے۔ روایت بننے سے لکھی چکی ہے۔ مجھے یہ بھی خیال آیا کہ شاید
 وہ بیمار ہے یا اس کا انتقال ہی ہو چکا ہے۔ آخر یہ کوئی انتہائی بات تو نہ تھی۔ اور اب مجھے
 پتہ لگو کیسے چھٹا۔ دو جھونکے کے علاوہ جواب علیحدہ ہر کچھ تھے۔ ہمارے درمیان کوئی اور شے
 نہ تھا جو میں ایک دوسرے کی یاد دلاتا رہا تھا۔ وہ سرگرمی ہے تو اس کی یاد کے کوئی معنی
 نہیں۔ ہے۔ مجھے کسی فرد کی موت سے بھلا کی پیمپی ہو سکتی ہے۔ یہ پہلی بات تھی۔ مجھے
 خوب پتہ تھا کہ میری موت کے بعد بھی لوگ مجھے بھول جائیں گے۔ اسی کا بعد سے کوئی واسطہ
 نہ رہے گا۔ میں یہ بھی نہیں کہ کتنا گریہ میرے غلط تھی۔ کوئی خیال ایسا نہیں ہے کہ انسانیت
 کے ساتھ اسی کا عالمی نہ ہو جائے۔ میرے خیالات اس گتہ پر پہنچے تھے کہ پادری اندر
 داخل ہوا بغیر امکان کے۔

جب میں نے اسے دیکھا تو مجھے کچھ سی ہوئی۔ وہ اسے بجانب گیا اور وہ بے کما
 کوڑے لے کر کوئی بات نہیں۔ میں نے اسے گھر کہا:
 "خوف کبھی نہ کبھی نہ آتا ہی ہے۔"

اسی نے جواب دیا کہ وہ دوستانہ طور پر آیا ہے اور اس کی آدھا میری اپیل سے
 کوئی واسطہ نہیں اور اس کے متعلق اسے کچھ علم بھی نہیں۔ وہ میری چارہ پانی پر بیٹھ گیا اور
 مجھے دعوت دی کہ میں اس کے قریب بیٹھوں۔ میں نے انکار کر دیا۔ میں نے دیکھا کہ وہ پھر
 بھی ٹھیک ٹھیک بیٹھ جاتی کہ نہ رہا۔

نہ تھی۔

وہ دوسری طرف دیکھنے لگا اور پھر جسے بغیر جسے کہا کہ کیا میں یا کسی کی وجہ سے تو یوں نہیں کہہ رہا۔ میں نے اسے بتایا کہ میں یہ نہیں ہوں۔ مجھے صرف خوف نہ رہا ہے اور یہ ایک عجیب بات ہے۔

”اگر آپ کی دگر سے لگا رہا ہے کہ آپ کی حالت میں جیسے مجھ کی تھی وہاں تک یہ دوسرا پہنچنے کے وقت اس کی طرف رجوع کرتے ہیں۔“

یہ سن کر وہ لگا کہ ”اے درگاہ کا حق ہے اور میں بھی اُس کے پاس وقت بہت ہے مگر یہاں تک میرا مقصد ہے۔ مجھے کسی کی مدد کی خواہش نہ تھی اور پہلے تو یہ ہے کہ میرے پاس وقت کہاں کا رہی، تو میں یہ کہتی ہوں جتنا جرح مجھے بالکل دلچسپ معلوم نہ ہوتی تھی۔“

اس کو اس نے بے چینی اور پریشانی کے عالم میں دیکھا تھا۔ مگر وہ سنیں گی اور اپنے ہاں کی سوچیں درست کرنے لگا۔ اس کے بعد وہ جھوٹے باتیں کرتے ہوئے مجھے مزید سے دوستی کہہ کر خطاب کرنے لگا۔ اس نے نہیں کہ مجھے موت کا حکم پہنچا تھا۔ ان کی بات میں ہم سب کو موت کا حکم پہنچا ہے۔ مگر میں نے غلط کام کرتے ہوئے اُس سے کہا:

”یہ ایک بے بات تو نہیں ہے۔ بہر حال اس سے کسی کی شکست خورگی نہیں ہوتی۔“
”شاید“ اُس نے کہا، ”مگر سب کو ایک دن مرنا ہے۔“ اُن کی نہیں تو کُل پہنچیں تو اُن سے کہہ کر اس میں ایک وقت کو ایک کر سنا کر دیا جائے۔“

میں نے جواب دیا:

”بالکل دیکھ ہی سیکہ کہ میں اب کر رہا ہوں۔“

وہ ایک ٹوہن بنیٹا رہا۔ بازو گھٹنوں پر لیجے۔ سر ہٹاتے ہوئے اپنے ہاتھوں کی طرف دیکھ رہا تھا۔ اس کے ہاتھ مارک تھے مگر کسی مرنے والی تھیں۔ انہیں دیکھ کر مجھے وہ بھر پور ہوا اور میں کا خیال آیا۔ وہ دوسری طرف نہ کر ایک دوسرے پر آرام سے گر کر مارا۔ پھر وہ دم بھر لگا۔ سر بہ توجہ جھکا کر دیکھ رہے تھے۔ اتنی دیر تک کہ مجھے خیال آیا کہ شاید وہ وہاں مرجی چکی ہو۔ لیکن اُس نے معنا سراٹھایا اور مجھے آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھا:

”آپ نے مجھے ملنے سے انکار کر دیا؟“ اُس نے کہا۔

میں نے جواب دیا:

”میں غلط پر ایمان نہیں رکھتا۔“

وہ جانتا تھا جتنا تھا کہ کیا مجھے اس بات پر یقین ہے اور میں نے جواب دیا:

”میں نے کبھی اپنے آپ سے یہ سوال پرچھے کی رحمت گوارا نہیں کی۔ مجھے یہ سوال فریضہ روزی معلوم ہوتا ہے۔“

وہ پھر بچے بہت گیا اور دیوار کے ساتھ ٹیک لگائی۔ اس کے ہاتھ اس کی رافٹ پر تھے۔ کچھ اسی انداز سے جیسے کہ وہ جھوٹے بات نہیں کر رہا۔ اُس نے کہا:

”اگر کوئی مرتد ہو جاتا ہے کہ اُسے پر یقین ہے کہ میں درحقیقت یوں نہیں ہوتا۔ میں نے کچھ نہ کہا۔ مگر خدایا کی طرف دیکھا اور مجھ سے سوال کیا:“
”آپ کا کیا خیال ہے؟“

میں نے جواب دیا کہ یہ ممکن ہے۔ بہر حال مجھے شاید اس بات کا پورا یقین نہیں کہ مجھے کی چیزیں دلچسپی ہے مگر میں میری مجھے دلچسپی نہیں ہے۔ اس کا مجھے پورا یقین ہے اور یہ ہے کہ وہ بات جس کا وہ کر رہا تھا اس میں مجھے ہرگز کوئی دلچسپی

اں پر وہ اٹھ کھڑا ہوا اور میری آنکھیں میں آنکھیں ڈال کر دیکھنے لگا۔ یہ چاہا
میں خوب پہچانتا تھا۔ میں ایمرنوی اور میسلط پریمی چا جانزی کر کے اکثر چاندوں پہلایا کرتا
تھا اور عام طور پر وہ آنکھیں مٹا دیا کرتے تھے۔ پاروی میں خوب جانتا تھا۔ میں فوراً
جھانپ گیا۔ اُس کی نظر کا پتہ نہیں رہی تھی اور نہ ہی اُس کی آواز میں کوئی فرق تھا جب کہ
اُس نے شیخ کہا۔

”کیا آپ کو کوئی امید نہیں ہے؟“ کیا آپ واقعی سمجھتے ہیں کہ مرث کے بعد آپ
کی طرف پرہیزگار بن گئے اور کچھ بات نہیں رہے گا۔
”ہی ڈن“ میں نے کہا۔

تب اُس نے آنکھیں جھپکائیں اور پھر سے بیٹھ گیا۔ اُس نے کہا کہ اُسے مجھ سے
واقعی بدردی ہے۔ اگر آدمی کا زندگی کے متعلق نظریہ وہی برج میرا ہے تو مینا وہاں
پر جاتا ہے۔ میں نے صوفی کی کہ اب اُس نے مجھے بد کرنا شروع کر دیا ہے۔ میں نے
پہلے مٹھائی اور وہ تھی دان کے نیچے چل دیا۔ میں کھنڈے دیوار کے ساتھ ٹیک کر کھڑا ہو گیا
میں اُس کی طرف توجہ دینے کی کوشش ہی نہیں کروا تھا مگر میں سمجھ کر وہ میرے پیر سوال
کر رہا ہے۔ وہ ایک تنگرا اور تیسرا دان میں باتیں کر رہا تھا۔ میں سمجھ کر وہ پریشان ہے۔ اُو
بہتر ہے کہ میں اُس کی بات نہیں ہی کروں۔

اُس نے مجھے بڑے اعتماد سے کہا کہ اُسے یقین ہے کہ میری پہلی منظور ہو جائے
گی مگر میں نے خواہ مخواہ گناہ کا ایک بوجھ اپنے اوپر ڈال دیا ہے۔ اور اس سے مجھے چھٹکارا
حاصل کرنا چاہئے۔ اُس کے مطابق انسان کا انصاف کچھ بھی نہیں اور نہ اس کا انصاف سب
کچھ ہے۔ میں نے کہا:

”مجھے انسان کی عزت نے مرث کا حکم سنایا ہے؟“

اُس نے جواب دیا کہ اس سے بہر حال میرا لگن تو نہیں دھسل جاتا۔

میں نے اُس سے کہا:

”مجھے معلوم نہیں کہ مرث کا کیا ہے۔ مجھے تو صرف یہ بتانا چاہیے کہ میرا ٹیم کیا ہے؟“

میں نے جزم کیا ہے۔ میں اُس کی سزا جگت رو بہوں اس سے زیادہ تو کوئی مجھ سے
تعامنا نہیں کر سکتا؟

اُس کو وہ پھر سے اٹھ کھڑا ہوا۔ میں نے سوچا کہ اُس گناہ کو ٹھوڑی میں اگر وہ حرکت
کرنا چاہتا ہے تو ایک ہی طریقہ اختیار کر سکتا ہے۔ وہ صرف میٹر سکتا تھا یا کھڑا ہو سکتا
تھا۔

میری نگاہیں فرش پر لگی ہوئی تھیں۔ اُس نے میری طرف ایک دم اٹھایا اور
دکھ گیا جیسے کہ اُسے قریب آنے کی جرات نہ ہو سکی۔ پھر وہ سناٹوں میں سے آسمان کی
طرف دیکھنے لگا۔

”تم غلطی پر ہو رہے ہو۔“ اُس نے تنبیہ کی سے کہا: ”تم سے اور تعامنا کیا
جا سکتا ہے۔ میں شاید تم سے یہ تعامنا کر دوں گا۔“
”کاش کہ کا۔“ میں نے کہا۔

”میں تم سے تعامنا کر دوں گا کہ تم دیکھنے کی کوشش کرو۔“

میں نے کہا:

”کیا دیکھنے کی کوشش کروں؟“

پاروی نے بغلیں جھانکنا شروع کر دیں اور جب اُس نے بات کی تو مجھے صوفی

یہ سنے کچھ جواب نہ دیا۔ پھر ٹھٹھنے میں اس نے کافی وقت دیا۔ اس کی سرحد پر گتے
چھت کو ذلت اور بدیشائی کی ہر جہر اٹھو۔ یہی کیجئے ہی ولا تھا کہ وہ میری سچا چھوڑے کہ
اس نے اسی کا لہو کر دنا شروع کر دیا اور میری طرف ہٹتے ہوئے گواہ
"نہیں نہیں! مجھے آپ کا اعتبار نہیں! آج مجھے تینیں سے کہہ کر ہر آپ میں دھڑ
زندگی کی خواہش ضرور ہے۔
میں نے جواب دیا:

عربی طور پر: "چہ گریہ سنے یہ خواہش اتنی ہی اہم ہے جیسا کہ امیر ہونے
کی آزادی یا تیرے سنے کی خواہش یا ایک موزوں چہرے کے ماکہ ہونے کی تمناؤں
سب کی نوعیت ایک ہے۔
میں اسی انداز میں بات کر رہا تھا کہ اس نے مجھے ٹوک دیا اور پوچھا کہ کیا اس کی
زندگی کا تصور کیا ہے۔ پھر میں چلا آیا
"ایک ایسی زندگی جو مجھے اس زندگی کی یاد دلائے۔ اور فورا ہی بعد میں نے
کہا کہ اب کافی پرچکا۔

وہ چا تھا تھا کہ میرے خدا کا تذکرہ چھوڑے مگر میں اس کی طرف بڑھا اور آخری
بار اسے سمجھانے کی کوشش کی کہ میرے پاس وقت بہت کم رہ گیا ہے اور میں اسے خدا
کے لئے غنائو نہیں کرنا چاہتا۔ چھوڑا اس نے تصویق دینے کی کوشش کی یہ کہتے ہوئے کہ
میں اسے ہر بار دہی کی طرح باپ کہہ کر خطاب کیوں نہیں کرتا۔ اس سے میں اور بڑ گیا
اور اسے جواب دیا کہ اس لئے کہ وہ میرا باپ نہیں ہے۔ بلکہ اس کے دو دوسروں
کا طرف دار ہے۔

یہ کہ اس کی آواز میں ایک دم بہت انصاف کی پیدا ہو گئی ہے۔
میں خوب جانتا ہوں کہ یہ ہتھکڑی دینا اور انسان کے مردود قسم سے بھر پور ہیں۔
میں انہی کو دیکھ کر ہتھکڑی جاتا ہوں۔ یہیں سا بیٹے کو میں اپنے دل کی گہرائیوں سے بات
کر رہا ہوں۔ یہ جانتا ہوں کہ تیرے سے میرا وہی چھوڑا کبھی نہ ہوں میں ایک رتانی چہرہ
کہا بلا دیکھتا ہے۔ وہی چہرہ ہے جسے دیکھنے کی میں آپ کو دعوت دے رہا ہوں۔
اس پر مجھے کچھ چڑھا گیا۔ میں نے کہا کہ کم از کم کم بینوں سے میں اللہ مرنے اور اٹھنے
فیصلوں کو دیکھ رہا ہوں۔ دیا ہوں۔ ذوقی چیز ہے۔ نہ کوئی شخص جسے میں ان سے بہتر
پرچکا ہوں۔ شاید بہت عرصہ ہو چکا ہے کہ میں نے کسی چہرے کی تلاش نہیں کی مگر وہ
چہرہ جس کی مجھے تلاش ہے۔ اس کا رنگ سرخ کی مانند سنہری اور اس کا شعلہ ایک
حسرت، ایک قتلے کے شوق لئے ہوئے ہے۔ یہ دہی کا چہرہ تھا۔ میں نے اسے بے گھر
ڈھونڈا۔ اب سب کچھ ختم ہو چکا ہے اور میری حالت میں نے کبھی چتر کی پسینہ جیسے ہست
نہیں دیکھا۔

یاد دہی نے مجھے ادا کی سے دیکھا۔ اب میں پوری طرح دیوار کے ساتھ کھڑا ہوں
کہ پیشا ہوا تھا اور مجھے دہی کی منگی کا تختے پر مسمی ہو رہی تھی۔ اس نے کچھ کہا جو میں نے
نہی پایا اور میرا ہانک اس نے پوچھا کہ کیا وہ مجھے بوسہ دے سکتا ہے؟
"نہیں۔۔۔ میں نے جواب دیا۔
وہ غرا اور دیوار کی طرف چلنا شروع کر دیا میں پر اچھستے وہ ہاتھ پیرتا جاتا
تھا۔

"آپ کو واقعی محبت ہے اس زمیں سے؟ اس نے اسے آہستہ سے کہا۔

میں میرے بیٹے، میرے کنہ عموں پر انقدر غصے ہوئے تھے کہ انہیں
مبارت، اقدار اور گرجہ نہیں اسی کا احساس نہیں۔ کیونکہ تھکاوٹ پر پتھر برنگا ہے۔
اُس نے مزید کہا:

میرے تبار سے ملنے والے کروں گا۔

پھر مجھے معلوم نہیں کیوں میرے کچھ نام رتھے جو میرے تبار سے ہیں نے ہند
آواز میں چٹان شروع کر دیا اور اسی کی بے عزتی کی اور میں نے اُنکی سے کہا کہ وہ میرے
میں نے فضول نہ کرے۔ میں نے اُسے گریبان سے پکڑ لیا۔ جو میرے دل میں آیا میں
نے اناپ شتاپ اسی پر تھوپ دیا۔ خوشحال اور غصے کی نئی جلی کیفیت میں میں اُسے تھکڑا
تھا۔

اس کا ذہن بڑی خود اعتمادی کا تھا۔ مگر میری نظریں اسی کے اقدار کی وقعت
ایک عورت کے بال بارہ تھیں۔ اُسے تو اپنی زندگی پر بھی یقین نہ تھا کیونکہ وہ ایک ٹریڈ
کی طرح زندہ تھا اور میں — مجھے معلوم تھا کہ میں خالی اقدار ہوں۔ مگر دراصل مجھے اپنے
آپ پر پورا اعتماد تھا۔ مجھے سب پر اعتماد تھا۔ اسی سے کہیں زیادہ۔ اپنی زندگی پر
اور اسی موت پر جو آنے والی تھی۔ ان: میرے پاس اسی اقدار کے ساتھ اور نہ تھا
کم از کم میں اسی حقیقت پر اتنا یقین تھا جتنا وہ مجھ پر اتنا تھا۔ میں جی تو تھا۔ میں
ہمیشہ حق پر تھا۔ میں نے اسی طرح اپنی زندگی گزار دی ہے اور اگر میں چاہتا ہوں اسے
ایک اور طریقے سے بھی گزار سکتا تھا۔ میں نے یہ کیا تھا اور وہ نہ کیا تھا۔ میں نے ایسے
کام کیے تھے مگر وہ دیکھ کر کام کہتے تھے۔ اور پھر ایسے معلوم ہوتا تھا کہ میں نے زندگی پر
اس فحشے انتظار میں گزار دی ہے۔ پوچھیے، کے انتظار میں تاکہ دوسری صداقت کی گرفت

دے سکتے۔ کسی چیز کی کوئی اہمیت نہ تھی اور مجھے خوب معلوم تھا کیوں میں میں ہانتا
تھا کہ کیوں۔ اسی ساری نے کار زندگی کے درمیان ایک گنگنم نامعلوم نفس میرے مستقبل
کی گہرائیوں میں گہا تھا۔ اسی سرواں کی پھانسیا ہوا چھوٹا جی موجود ہی میں تھا جسے تھے
میرے طرف بڑھتا رہا اور مجھے تھا کہ اسی زندگی کی کوئی اہمیت نہیں ہے۔ مجھ میرے
نے کیا اہمیت پر سکتی ہے۔ دوسروں کی موت کی، ایک ماں کی محبت کی، خدا کے وجود
کی، اسی عزت زندگی کی جراثیمی اپنے لئے انتخاب کرتا ہے۔ اس تقدیر کی جیسے وہ اپنے
میں چھ لیتا ہے۔ مگر وہی تقدیر مجھ پر ہے کہ نہ صرف مجھے بلکہ مجھ جیسے لاکھوں کروڑوں
آدمیوں کو چنے۔ مجھے تو صرف ایک زندگی ملی اور میرے ساتھ لاکھوں کو نہیں دیا۔ اسی
حاصل ہے مگر اپنے آپ کو میرا بھائی کہتے ہیں۔

سمجھاؤ اسے! پھر اسے وہ سمجھاؤ ہر زندہ انسان کو اقدار حاصل ہے۔ سب
کو روایت اور حق حاصل ہے۔ انسان کی ایک ہی قسم ہے۔ دوسروں کو بھی کس قسم نفس
کا حکم ملے گا۔ ان کو بھی کوئی موت کا حکم ملے گا۔ کسی پر الزام لگانے کی بھلا ضرورت
ہی کیا ہے کہ وہ اپنی ماں کے جنازے پر نہ روئے۔ اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔ آخر مزاح
سب سے کہ ہے۔ سمجھاؤ کہ اتنا زیادہ جیتی ہے یا اس کی بیوی؟ وہ میری کئی شہزادہ عورت جو
ماکت نہیں پڑی وہ جو جیتی ہی مجھ سے جیسے میری کی وہ عورت جس نے عیسٰی سے شادی کر
لی تھی یا مادری کی کہ خاتون رہی کہ میں اُس سے شادی کروں۔ اسی کی کیا اہمیت ہے کہ
میں بڑا بن کر رہے یا سلیطہ کس کی تقدیر کے۔ یہ وہ ہے۔ اسی کی کیا اہمیت ہے
کہ اسی کو کس نے روس سے عشق کی چٹکیں بڑھادی ہے۔ ایک ایسے آدمی کی حیثیت
میں جسے خود موت کا حکم مل رہا کہ وہ میری اتنی بات بھی نہ سمجھ سکتا تھا کہ مستحباب کے

اندھیر دلم سے میرا دیا کیا مراد ہے۔ چوتھے چلتے میرا دم گھٹنے لگا۔ سیاہی بھاگتے ہوئے اندر آئے۔ اور یاد رہی کہ میری گرفت سے چوٹینے کی کڑھائی کرنے لگے۔ ایک سیاہی نے مجھے مارنے کی دھمکی دلا کر یاد رہی ہے انہیں سمجھا بھلا کر انگ انگ کر دیا۔ وہ مجھے دم بھر غارتھی سے دیکھتا رہا۔ اُس کی آنکھیں آئینوں سے بھر چکی تھیں۔ اُن کے کمر ٹوڑی اور میری کواٹھری سے چب گیا۔

اُس کے پلے جانے کے بعد مجھے کچھ سوچا آیا۔ میرا تھکان سے بڑھ چلا ہوا تھا میرا تختہ پر سیت۔ یہ دیکھ کر میرا خیال ہے کہ میں بہت دیر تک سوچا کہ میری جی بڑی آنکھ کی کھلی قرشا سے میرے منہ پر پاک رہے تھے۔ وہ بات کہ صدمہ آگئی کی مجھے زانیہ دس رہی تھیں۔ رات کی غصہ ہی بڑا جو زمین اور ملک کی خوشبو سے غصہ تھی۔ میرے گاہوں کو لگ رہی تھی۔ موسم گرما کا پڑوسی سکون سمندر کی مہروں کی طرح مجھے تھپک تھپکا کر دیتا دے رہا تھا۔ پوچھنے سے ذرا پیچھے میں نے مجاز کا ساثری بنا۔ اُس نے کب ایس دنیا میں رحمت صفا نہ ملنے کا اعلان کیا جس سے آپس میں بالکل بے نیاز تھا۔ مہینوں بعد یہی بات مجھے اُمی کی یاد آئی۔ اب یہی سمجھا کہ وہ زندگی کے اواخر میں ایک شہسوار کیوں سے بھیجی تھیں انہوں نے زندگی کا کھیل ازمرو کیوں کھینچا تھا۔ وہاں بھی بڑھوں کی راتیں گھوٹی زندگی کے چراغ لگی ہوئے تھے اور شام ایک آفسروہ اتنا بے جاگ۔ ایک عارضی صلی کا اعلان کر رہی تھی۔ موت کے اس قدر قریب اُمی کی خواہش ہو گئی کہ وہ آزاد و موصوں کی دے اور نئے سرے سے زندگی کی تیاری کر سکے۔ دنیا میں کسی کو اس پر آئندہ ہانے کا حق نہیں پہنچتا۔ اور یہ بھی نئے سرے سے ایک نازہ زندگی کی تیاری کر رہا ہوں۔ یوں معلوم ہوتا ہے کہ اُس غضب کے فتنے سے مجھے سب آگائشوں سے پاک کر دیا ہے۔ میر

اور انگ سے خالی اس تاروں بھری رات میں مجھ پر پہلی مرتبہ دنیا کی نازک نرم اور طامس بے نیازی کا راز کھلا۔ یہیں میرے اپنے تجربے کے مطابق تھا۔ نئی فرح آدم میں ایک مسئلہ اخوت ہے۔ اب مجھے نایت خوشی کا احساس ہوا۔ اب یہی طمٹیں تھیں۔ یوں منزل مقصود پر کہ میری تنہائی کا احساس کم ہو گیا۔ صرف ایک خواہش باقی رہ گئی۔ ایک ارمان کہ میرے حق کے دلی بہت سے قاتلانہی جمع ہوں اور وہ میرا مستقبلانہ خیریت کے بھرپور غروں سے کریں۔



مزید کتب پڑھنے کے لیے آج ہی وزٹ کریں: www.iqbalkalmati.blogspot.com

باقیاتِ اقبالؒ

1435

سید عبدالواحد ۰ محمد عبداللہ قریشی

باقیاتِ اقبال میں حضرت علامہ اقبالؒ کا وہ کلام شائع کیا گیا ہے جو ان کی اپنی مطبوعہ تصانیف میں کسی وجہ سے جگہ پانے سے رہ گیا۔ ہر نظم یا غزل کے متعلق جو اس مجموعہ میں ہے حتیٰ الوسع تحقیقات کر لی گئی ہے کہ یہ علامہ مرحوم ہی کی ہے۔ جو چیز جہاں سے لی گئی ہے اس کا حوالہ دیا گیا ہے اور کلام کو تاریخ دار درج کیا گیا ہے تاکہ خیالات کا ارتقا سمجھنے میں مدد ملے۔ بعض نقیص اقبالؒ کی زندگی پر بالکل نئی روشنی ڈالتی ہیں۔

قیمت

۴۵/-

روپے

